تعلیم و تربیت
ستمبر 2017
بنکر نمبر 45
صفحہ نمبر 4

ستمبر 2017ء

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یوم دفاع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو اور عزیز ساتھیو! کیسے ہیں آپ؟ امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اب تو آپ کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور اسکول بھی کھل گئے ہیں۔ اب دوبارہ پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ چھٹیوں میں آپ نے خوب آرام کیا، کھیلا کودا، سیر و تفریح کی لیکن اصل کام کیا......؟ جی ہاں آپ نے اپنی چھٹیوں کا کام مکمل کیا......؟ یقیناً کیا ہو گا کیوں کہ آپ تو ہیں بہت پیارے اور محنتی بچے۔ امید ہے ''تعلیم و تربیت'' رسالہ پڑھ کر آپ کی تعلیم بھی اچھی ہو گی اور تربیت بھی۔ کیوں ٹھیک کہا ہے ہم نے......؟

پیارے بچو! ستمبر میں عیدالاضحیٰ بھی ہے۔ اس عید پر حضرت ابراہیمؑ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے بہت سے جانور ذبح کیے جائیں گے۔ کوشش کریں قربانی کے گوشت میں مستحقین افراد اور غریبوں کا خیال رکھیں۔ اس عید کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایثار کیا جائے۔ یعنی اپنی چیز کو دوسروں دی جائے۔ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی پر ترجیح دینا ایثار ہے لہٰذا اللہ کی رضا اور سنتِ ابراہیمیؑ کو پورا کرنے کے لیے ایثار پر عمل کیا جائے۔

ستمبر کے شمارے میں آپ 11 ستمبر کے حوالے سے مضمون پڑھیں گے۔ 11 ستمبر، ہمارے قائد محمد علی جناحؒ کا یوم وفات ہے لہٰذا ان کے لیے ضرور فاتحہ خوانی کیجیے۔ 6 ستمبر یوم دفاع کے حوالے سے بھی کہانی شامل ہے۔ پیارے بچو! ''آپ بھی لکھیے'' سلسلہ میں کہانی بھیجتے وقت اپنا مکمل پتا اور فون نمبر ضرور لکھیے آپ کی کہانی (کمپوزڈ) رسالے کے فارمیٹ کے مطابق ڈیڑھ کالم کی ہونی چاہیے۔ طویل کہانیاں ''آپ بھی لکھیے'' میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ ''تعلیم و تربیت پڑھیے اور اپنی تجاویز، پسند اور تنقید سے آگاہ کریں۔ فی امان اللہ!

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمدِ باری تعالیٰ

قلب و جاں کا قرار ہے اللہ
زندگی کی بہار ہے اللہ

کتنا دشوار، کس قدر مشکل
رحمتوں کا شمار ہے اللہ

کیا مدینہ ہے اور کیا مکہ
مجھ کو دونوں سے پیار ہے اللہ

تیرا محبوب ﷺ بھی ترے جیسا
رحمتوں کا حصار ہے اللہ

تیرے محبوب ﷺ کا ملے سایہ
التجا ہے ، پکار ہے اللہ

دل کا شیشہ بھی جگمگا اٹھے
اس پہ گرد و غبار ہے اللہ

ذکر تیرا ہے جب سے وردِ لب
دل کو کتنا قرار ہے اللہ

تیرے مسرورؔ کی طلب ، تجھ سے
عجز ہے انکسار ہے اللہ

نعت رسولِ مقبول ﷺ

محبت کا ذرا ادراک مل جائے
مجھے بھی دیدۂ نمناک مل جائے

مدینے کو سمونا چاہتا ہوں میں
نظر کو وسعتِ افلاک مل جائے

جو مانگا تھا مجھے وہ مل گیا ہے اب
جو مانگوں وہ رسولِ پاک ﷺ مل جائے

میں آنکھوں سے لگا لوں گا کہیں سے جو
مدینے کا خس و خاشاک مل جائے

سکونِ دل ، قرارِ جاں نہیں ملتا
کسی صورت شہِ لولاک ﷺ مل جائے

تمنا ہے تو بس دو گز زمیں کی ہے
مدینے میں بھی املاک مل جائے

میں بھوکا ہوں مدینے کی ہواؤں کا
بس اتنا ہو ، مری خوراک مل جائے

میں سمجھوں گا مدینہ مل گیا مجھ کو
مدینے کی جو تھوڑی خاک مل جائے

ہیں جتنے عیب وہ مسرورؔ چھپ جائیں
کرم کی جو ہمیں پوشاک مل جائے

مسرور کیفی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں شامل کیا ہے، تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے۔ (الحج:36)

پیارے بچو! اس آیت مبارکہ میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے ۔شعائر اُن خاص احکام و عبادات کا نام ہے جو دینِ اسلام کی علامات سمجھی جاتی ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، اذان، قربانی وغیرہ۔

دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارے لیے قربانی کے جانور میں خیر و بھلائی اور بے شمار فائدے رکھے گئے ہیں۔ یہ فائدے دنیا کے بھی ہیں اور آخرت کے بھی۔

چار دنیوی فائدے: (1) قربانی میں دنیا کا ایک اہم فائدہ جانوروں کا لذیذ گوشت ہے، جس سے ہم نت نئی ڈشز کی صورت میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(2) دوسرا فائدہ قربانی کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے، اس سے جائے نماز یا بچھونے کی صورت میں نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(3) تیسرا فائدہ بے چارے فقراء و مساکین جو سارا سال بوٹی بوٹی کے لیے ترستے ہیں، وہ بھی اس موقع پر گوشت کا ذائقہ چکھ لیتے ہیں۔

(4) چوتھا فائدہ عید کے موقع پر دنیا بھر میں جانوروں کا بیوپار ہوتا ہے جس سے تاجر خوب سیزن کماتے ہیں۔

آخرت کے لحاظ سے بھی جانور کی قربانی کرنے کے بے شمار فائدے ہیں، جو مختلف احادیث مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بقر عید کی دس تاریخ کو کوئی بھی نیک کام اللہ کے نزدیک (قربانی کا) خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں اور سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا (اور یہ چیزیں ثواب عظیم کا ذریعہ بنیں گی)'' نیز فرمایا کہ ''قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ قبولیت پا لیتا ہے، لہٰذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔'' (ابن ماجہ، کتاب الاضاحی:3126)

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یا رسول اللہ! ﷺ ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ طریقہ تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ سے جاری ہوا ہے اور یہ ان کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ''ہمیں ان میں کیا (اجر و ثواب) ملتا ہے؟'' فرمایا: ہر بال کے بدلے ایک نیکی! عرض کیا: ''اون والے جانور یعنی بھیڑ دنبہ کے ذبح پر کیا ملتا ہے؟'' فرمایا ''ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ملتی ہے۔'' (ابن ماجہ، کتاب الاضاحی:3127)

چار اُخروی فائدے :مذکورہ دو حدیثوں میں قربانی کے اخروی فوائد کو بیان فرمایا ہے: (1) قربانی کے جانور کے ذبح پر خون کے پہلے قطرہ پر قربانی کرنے والے کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

(2) قربانی اللہ تعالیٰ کے نزدیک دس ذی الحجہ کو کیے جانے والے اعمال میں سے سب سے زیادہ محبوب عمل ہے۔

(3) قربانی کے جانور کے بال، سینگ اور کھر یہ سب ثواب کی صورت میں قربانی کرنے والے کو ملیں گے۔

(4) قربانی کرنے والے کو قربانی کے جانور کے بدن پر موجود ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ملتی ہے۔

پیارے بچو! قربانی کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ خوش دلی سے ادا کرنا چاہیے، اللہ کی رضا سب سے مقدم ہو پھر یہ سب دنیا و آخرت کے فائدے بھی حاصل ہو جائیں گے، کیوں کہ نیت کی خرابی اچھے بھلے عمل کو فاسد کر دیتی ہے۔

☆☆☆

فضا ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ، بموں کے دھماکوں اور توپوں کی گھن گرج سے گونج رہی تھی۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ اس سارے شور وغل، دھماکوں اور بھگدڑ سے بے نیاز ایک بوڑھا کسان اپنے مکئی کے کھیت میں تلائی کر رہا تھا۔ یہ احمد خاں تھا۔ بالکل ان پڑھ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ سوائے اپنے کھیتوں کے اسے دنیا کے اور کسی کام سے دل چسپی نہ تھی۔

6 ستمبر 1965ء کی رات کو بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر کے احمد خاں کے گاؤں قاضی پور اور اس کے آس پاس کے سرحدی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے محفوظ جگہوں کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ خود احمد خان کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر دوسرے لوگوں کے ساتھ قاضی پور سے چلی گئی تھی۔ مگر احمد خاں برابر اپنے کام میں لگا تھا۔ اسے تو یہ خبر بھی نہ تھی کہ اس کا گاؤں دشمن کے قبضے میں آ چکا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک جیپ اس کے مکئی کے کھیت کو روندتی ہوئی اس سے کوئی چار گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ایک فوجی باہر نکلا اور جیپ کی کوئی کل درست کرنے لگا۔ اپنے مکئی کے کھیت کو برباد ہوتے دیکھ کر احمد خاں سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اٹھ کر چلایا:

''اے! اے! کون ہو تم؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ تم نے میری ساری مکئی کا ناس کر دیا ہے۔''

لیکن فوجی اسی طرح جیپ درست کرنے میں لگا رہا، جیسے اس نے احمد خاں کی بات سنی ہی نہ ہو۔ احمد خان کھرپی ہاتھ میں لیے اس کے قریب آیا اور اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سنا نہیں تم نے؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ تم نے میری مکئی کا ناس کر دیا ہے۔''

اس پر وہ فوجی اچانک مڑا، پستول نکال کر احمد خاں کی طرف تان لیا اور بولا۔ ''اب اگر تم نے کچھ کہا تو گولی مار دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ احمد خاں کی طرف دل چسپی سے دیکھتے ہوئے چلا اٹھا۔ ''ارے! جنگ بہادر تم!''

''میرا نام جنگ بہادر نہیں، احمد خاں ہے، احمد خاں۔''

فوجی احمد خاں کے قریب آیا اور اس کی ڈاڑھی مونچھوں کو کھینچ کر دیکھنے لگا، جیسے اطمینان کرنا چاہتا ہو کہ وہ نقلی تو نہیں۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور کہا:

''سنو بڑے میاں! تمھیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ چلو، جیپ میں بیٹھ جاؤ۔''

''میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ ابھی تلائی کا اتنا کام پڑا ہے۔ میں اسے شام ہونے سے پہلے پہلے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کام ختم ہو گا تو جاؤں گا، اپنے بیوی بچوں کے پاس۔''

فوجی نے سختی سے کہا۔ ''جیسا میں کہتا ہوں، ویسا کرو۔ اگر ذرا بھی آنا کانی کی تو گولی مار دوں گا۔ تمھیں پتا نہیں، یہ سارا علاقہ اب ہمارے قبضے میں ہے۔''

احمد خاں بے چارے کو کیا پتا ہو سکتا تھا۔ اس کی دنیا تو اس کے کھیتوں تک تھی۔ لیکن دوسروں کی طرح جان اسے بھی پیاری تھی۔ فوجی نے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تو وہ چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گیا۔ فوجی تھوڑی دیر جیپ کی کل درست کرتا رہا، پھر چند منٹ بعد وہ بھی جیپ میں آ بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔

احمد خاں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ وہ پہلی بار اپنے کھیتوں سے جدا ہو رہا تھا اور وہ بھی اپنی مرضی کے خلاف۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جیپ ایک چھاؤنی میں داخل ہوئی۔ چاروں طرف فوجی ہی فوجی نظر آ رہے تھے۔

فوجی نے جیپ ایک جگہ روکی اور احمد خاں کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ احمد خاں جیپ کے باہر آیا تو فوجی نے پستول تان کر اس کا رخ احمد خاں کے سینے کی طرف کر دیا اور کہا۔ ''چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ!''

احمد خاں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اسے لے کر اپنے افسر کے پاس گیا۔ پہلے وہ دونوں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے، پھر افسر نے احمد خاں سے اس کا نام اور اس کے باپ کا نام وغیرہ پوچھا۔ اس کے بعد اس نے بھی احمد خاں کی ڈاڑھی مونچھوں کو کھینچ کر دیکھا اور جب اسے ان کے اصلی ہونے کا اطمینان ہو گیا تو فوجی سے کہنے لگا:

''واقعی دونوں آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں لیکن اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

فوجی نے جواب دیا۔ ''سر، مجھے اچانک ہی یہ بات سوجھی تھی۔ ان دونوں کی مشابہت حیرت انگیز ہے۔ جنگ بہادر نے ہمیں اتنی قیمتی معلومات مہیا کی ہیں کہ اس کا کام ہمارے باقی سب جاسوسوں پر بھاری ہے۔ اس بات کا علم ہمارے دشمن کو بھی ہے اور اس نے جنگ بہادر کی گرفتاری کے لیے بھاری انعام مقرر کر رکھا ہے۔ اس کے ہر کمانڈر کے پاس جنگ بہادر کی تصویر ہے۔''

''پھر؟'' افسر نے پوچھا۔

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، کل پاکستانی فوج ہمارے اگلے مورچوں پر جوابی حملہ کرنے والی ہے اور ہم ان مورچوں کو خالی کر رہے ہیں۔ اگر حملے کے بعد دشمن کو ان مورچوں میں جنگ بہادر کی لاش ملی تو وہ اس کی طرف سے بے فکر ہو جائے گا اور وہ اطمینان سے اپنا کام کرتا رہے گا۔''

''جنگ بہادر اس وقت کہاں ہے؟'' افسر نے پوچھا۔

''اس وقت وہ ایک کوٹھی میں مالی کا کام کر رہا ہے اور یہ کوٹھی ہمارے دشمن کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے سو گز کے فاصلے پر ہے۔''

''تجویز تو تمہاری لاجواب ہے۔'' افسر نے کہا۔ ''وقت صرف یہ ہے کہ ہماری توقع اور امید کے خلاف دشمن نے آج صبح ہی ہمارے اگلے مورچوں پر حملہ کر دیا ہے۔''

''آج صبح؟''

''ہاں۔ اس حملے کی ہمیں امید نہ تھی۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ دشمن کی طرف جوابی حملہ اتنی جلدی ہو جائے گا۔ بہرحال، اب ہم اگلے مورچوں کو خالی کر کے پچھلے مورچوں میں آ چکے ہیں۔ بلکہ

دشمن کے سخت دباؤ کی وجہ سے شاید ہمیں ان مورچوں سے بھی پیچھے ہٹنا پڑے۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے یہ مورچے خالی کر رہے ہیں۔ اس وقت دس بجے ہیں۔ شاید اب بھی کچھ وقت ہے۔''

یہ کہتے ہوئے افسر نے احمد خاں کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی قصائی بکرے کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ''واقعی دونوں بہت ملتے جلتے ہیں۔ سخت حماقت ہو گی اگر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔''

اس کے بعد دونوں میں پھر کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ پھر افسر نے کہا۔ ''کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم اسے بنکر نمبر 45 پر پہنچا دو اور سپاہیوں کو ہدایت کر دو کہ مورچے خالی ہونے کا حکم ملنے تک اسے وہیں رکھا جائے۔ جب مورچے خالی کرنے کا حکم ملے تو اسے گولی ماردی جائے۔''

فوجی نے افسر کو سلیوٹ کیا اور احمد خاں کو لے کر باہر چلا گیا۔ افسر اور سپاہی کے درمیان جو گفت گو ہوئی تھی، احمد خاں اسے بہت کم سمجھ سکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس نے فوجی سے کہا:

''اے میاں، میں اپنے کھیتوں میں کب واپس جاؤں گا؟''

فوجی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''فکر نہ کرو، بڑے میاں۔ تم بہت جلد زمین میں پہنچ جاؤ گے۔''

فوجی نے احمد خاں کو جیپ میں بٹھایا۔ اس میں چار سپاہی پہلے سے بیٹھے تھے۔ احمد خاں کو ان کے سپرد کرنے اور مکمل ہدایات دینے کے بعد وہ فوجی وہاں سے چلا گیا اور جیپ بھی نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جیپ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس جا کر رکی۔ سپاہی احمد خاں کو ایک مورچے میں لے گئے۔ مورچے میں بہت سے سپاہی بیٹھے تھے۔ سپاہیوں نے مورچے میں موجود ایک افسر کو احمد خاں کے بارے میں بتایا۔ افسر نے دو تین سپاہیوں کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دیں۔ وہ سپاہی احمد خاں کو اس مورچے سے نکال کر بنکر نمبر 45 کی طرف لے چلے۔

بنکر کیا تھا، اچھی خاصی قبر تھی۔ احمد خاں اپنے انجام سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اس جگہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ سپاہیوں نے اسے بنکر کے ایک کونے میں کھڑا کیا اور پھر ایک سپاہی نے بندوق تان لی۔ عین اسی وقت زور کا دھماکا ہوا۔ احمد خاں منہ کے بل گر پڑا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ نرسیں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ ایک آواز اس کے کان میں پڑی۔ ''یہ بڑے میاں تو ہمارے اپنے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ دشمن کے بنکر میں کیا کر رہے تھے؟''

احمد خاں نے ارد گرد دیکھا۔ بستروں پر اور بہت سے زخمی پڑے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''ارے میاں، اب میں کہاں ہوں؟''

ایک نوجوان نے پاس آ کر کہا۔ ''بڑے میاں، تم تو قریب قریب اگلے جہان پہنچ چکے تھے۔ تم ہو کون؟''

ایک اور نوجوان اس کے قریب آیا اور وہ دونوں اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''بڑے میاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بس ذرا دھماکے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ بہتر ہے انہیں کرنل صاحب کے سامنے پیش کیا جائے۔ کون جانے یہ کوئی جاسوس ہو۔''

دوسرا نوجوان احمد خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''بڑے میاں، تم چل پھر سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو آؤ، ہمارے ساتھ۔''

نوجوان نے سہارا دے کر احمد خاں کو اٹھایا اور اسے باہر کھلے صحن میں لے گیا۔ وہاں ایک کونے میں میز پڑی تھی جس پر ایک کرنل بیٹھا تھا۔ اس نے احمد خاں کی طرف دیکھا تو حیرت سے نوجوان سے کہنے لگا:

''ارے! تمہیں پتا بھی ہے تمہارے ہاتھ کیا چیز لگی ہے؟''

''نہیں، جناب۔''

''یہ جنگ بہادر ہے، جنگ بہادر'' کرنل نے کہا۔ ''دشمن کا سب سے بڑا جاسوس۔'' دونوں نوجوان حیرانی سے اچھل پڑے کرنل احمد خاں سے کہنے لگا۔ ''ہاں تو بھئی، جنگ بہادر۔ آخر تم قابو میں آ ہی گئے۔ اس بار ہم تم سے بہت ہوشیار رہیں گے۔ اب تمہارے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہ میرے ساتھ کیا تماشا ہو رہا ہے؟'' احمد خاں نے چیخ کر کہا۔ ''میں تنگ آ گیا ہوں اس سے۔ میرا نام جنگ بہادر نہیں ہے۔ میں تو احمد خاں ہوں، قاضی پور کا احمد خاں۔''

دونوں نوجوان ہنس دیئے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا۔

''خوب! خوب! یہ جاسوس بھی کمال کا بہروپ بھرتے ہیں۔''

کرنل نے کچھ کاغذات کا معائنہ کیا، پھر کہنے لگا۔ ''ہم تمہیں یہ ثابت کرنے کا پورا پورا موقع دیں گے کہ تم جنگ بہادر نہیں، احمد خاں ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم بھارتی فوج کے بنکر یعنی خندق میں کیسے پہنچے؟''

احمد خاں نے کرنل کو بتانا شروع کیا۔ ''جناب، میں صبح کے وقت اپنے مکئی کے کھیت میں نلائی کر رہا تھا کہ ایک جیپ میرے کھیت میں آ کر رکی اور......''

اور اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ساری کہانی سنا دی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اور جناب میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ جنگ بہادر اس وقت کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟'' کرنل نے دل چسپی سے پوچھا۔

احمد خاں نے دماغ پر زور دیا، پھر کہنے لگا کہ وہ جناب...... وہ جناب...... ایک کوٹھی میں مالی کا کام کر رہا ہے۔ یہ کوٹھی سو گز دور...... ہیڈ...... ہیڈ......''

''ہیڈ کوارٹر؟''

جی، جناب۔ ہیڈ کوارٹر سے سو گز دور ہے۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

احمد خاں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ تمام باتیں بتا دیں جو بھارتی فوجی افسروں کے درمیان ہوئی تھیں۔ کرنل نے گھنٹی بجا کر ایک افسر کو طلب کیا اور کہا:

''ہیڈ کوارٹر کو فون کرو اور کہو کہ ہیڈ کوارٹر سے سو گز کے فاصلے پر جو کوٹھی ہے، اس کے مالی کو گرفتار کر لیا جائے۔''

افسر سلیوٹ کر کے چلا گیا۔ احمد خاں کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور کمرے کے باہر دو سپاہی نگرانی کے لیے مقرر کر دیے گئے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ایک اور افسر وہاں آیا۔ کرنل نے اس سے پوچھا۔ ''ہیڈ کوارٹر سے کوئی پیغام آیا؟''

''یس سر'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ مالی گرفتار کر لیا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ جنگ بہادر ہی ہے۔''

یہ سنتے ہی کرنل سیدھا احمد خاں کے کمرے میں آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ ''بڑے میاں، آپ کی بدولت ہم دشمن کے ایک اہم جاسوس کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حکومت آپ کو اس خدمت کے عوض بھاری انعام دے گی۔''

''مجھے انعام وانعام کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو اپنے کھیت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ نلائی کا سارا کام پڑا ہے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

کرنل قہقہہ مار کر ہنس دیا اور بولا۔ ''آپ کس دنیا میں رہتے ہیں، بڑے میاں؟ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بھارتی فوجوں نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ کا گاؤں اور اس کے آس پاس کا سارا علاقہ دشمن کے قبضے میں ہے۔''

پھر کرنل یکایک سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کو اپنے کھیتوں سے، اپنی دھرتی سے، اپنے وطن کی مٹی سے اتنا پیار ہو سکتا ہے۔ میں آپ کے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں۔''

دوسرے ہی لمحے کرنل اٹین شن ہو کر احمد خاں کو سلیوٹ کر رہا تھا!

☆☆☆

سنہرے لوگ:

مریم مختار شہید

18 نومبر 1992ء کو کراچی میں کمانڈر (ر) مختار احمد شیخ کے گھر رحمت نے جنم لیا۔ کمانڈر صاحب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس رحمت کا نام مریم رکھ دیا۔ مریم نے آرمی پبلک اسکول ملیر کینٹ کراچی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کیڈٹ کالج سے فراغت کے بعد آرمی میں اپلائی کیا۔ اس کو بچپن سے ہی فائٹر پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ بہت سے لوگوں نے اسے سمجھایا کہ یہ حساس ترین انتخاب ہے مگر اس کے قدم بالکل بھی نہیں ڈگمگائے۔ اس وقت اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب وہ 132 گریڈ میں فائٹر پائلٹ کے طور پر بھرتی ہوئی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ پاکستان کے لیے اپنے تن من دھن کی قربانی کے لیے ہمہ وقت تیار تھی اور پھر ایک دن وہ 23 سال کی عمر میں بدھ 24 نومبر 2015ء کو میانوالی میں کچھ گجرات کے مقام پر پاک فضائیہ کے طیارے ایف سیون (FT-7PG) کے حادثے میں شہید ہو گئیں جنہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ حکومت نے مریم مختار کو ان کی بہادری پر تمغہ بسالت دینے کا اعلان کیا۔ 23 مارچ 2016ء کو صدر ممنون حسین نے ''تمغہ بسالت'' ان کے والدین کی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلندیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں

(زیب النساء، راہوالی کینٹ)

15 اگست 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ جسٹس عبدالرشید نے ان سے حلف لیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان بنے اور انہوں نے اپنی کابینہ بنائی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہی مسلسل محنت اور دن رات تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مختلف شہروں میں مسلمانوں کے جلسوں سے خطاب کے لیے جانے کی وجہ سے قائداعظم کی صحت گر رہی تھی۔ انہیں چند سال قبل ہی تپ دق (ٹی بی) کی بیماری کی بھی تشخیص کی گئی تھی۔ ان کی بیماری کا یہ راز صرف قائداعظم، محترمہ فاطمہ جناح اور ان کے معالج کے درمیان ہی تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ڈوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر ان کی بیماری کی یہ خبر ان کے دشمنوں، انگریز اور ہندو کو لگ جاتی تو شاید قیام پاکستان کا خواب ادھورا رہ جاتا۔

مسلسل گرتی ہوئی صحت کے باوجود انہوں نے تحریکِ پاکستان کی باگ ڈور سنبھالے رکھی اور جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے مسلم لیگ کے رہ نماؤں کے بے حد اصرار پر گورنر جنرل بننا قبول کیا۔ وہ اپنی تنخواہ صرف ایک روپیہ لیتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ دراصل ہندو مسلم فسادات نہ تھے بلکہ ہندو اکثریت کی مسلمان اقلیت (کم تعداد والے) کو قتل کرنے کی سازش تھی۔ ہندوؤں نے چن چن کر مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر تباہ کیا اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ ہماری ہزاروں مسلمان لڑکیوں کو اغواء کیا۔ یہ ہماری تاریخ کا وہ دل خراش اور نہ بھلانے والا باب ہے جس سے ہم سب کو آگاہ ہونا چاہیے۔ جو مسلمان قافلے پاکستان پہنچ رہے تھے وہ لٹے پٹے اور زخموں سے چور تھے۔ یہ رُلا دینے والا منظر جہاں دوسرے مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ تھا، وہیں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے لیے بھی دکھ کا باعث بنا۔

قائداعظم فوراً لاہور پہنچے، کیوں کہ لٹے پٹے قافلے اسی راستے سے زیادہ تر پاکستان آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے کشمیر کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا۔ ابھی دونوں جانب کی فوجوں کی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔ انڈیا نے اپنی فوجوں کو کشمیر کی جانب روانہ کر دیا۔ اس مکروہ کھیل میں گاندھی، پنڈت نہرو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل شامل تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ہندوستان کی تقسیم سے قبل وائسرائے تھے اور آزادی کے بعد وہ انڈیا کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ یہ تمام لوگ کشمیر پر غاصبانہ قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے، جب کہ ہندوستان کی تقسیم اسی اصول کے تحت عمل میں آئی تھی کہ جس علاقے میں ہندو آبادی اکثریت میں ہے وہ علاقے انڈیا میں شامل ہوں اور جن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں وہ پاکستان کا حصہ بنیں گے۔ انڈیا نے اس پر عمل نہیں کیا اور مسلمان اکثریتی علاقے کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ کشمیر انڈیا کی لالچ کی بناء پر آج تک متنازعہ مسئلہ بنا ہوا ہے اور بھارتی فوجیں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں۔

قائداعظم آہنی عزم و ارادے کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی میں بڑے بڑے مسائل اور مشکلات کا سامنا کیا اور برداشت کیا، مگر مسلمانوں کے ظلم وستم کا یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ انہیں افسوس اس بات پر تھا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی گئی۔ انگریز اور ہندو، پاکستان کو کمزور کرنے کی سازش کا حصہ بنے اور اپنے تمام تر وعدوں سے پھر گئے۔ قائداعظم نے کسی طور وعدہ خلافی نہیں کی۔ انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کرکے یہ ثابت کیا کہ مسلمان کسی کو دھوکہ نہیں دیتا اور نہ ہی وعدے سے پھرتا ہے۔

یہ تمام تر واقعات و حالات ایسے زخم تھے، جنہوں نے قائداعظم کی گرتی ہوئی صحت پر مزید اثر ڈالا اور وہ نڈھال ہو گئے۔ قائداعظم کو ڈاکٹروں کی ہدایت پر کوئٹہ کے پُرفضا مقام زیارت منتقل کردیا گیا۔ زیارت میں قائداعظم کے ہمراہ ان کی عزیز بہن محترمہ فاطمہ جناح اور ان کے معالج کی ٹیم مسلسل دن رات ان کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ قائداعظم زیارت میں بھی حکومتی معاملات نمٹا رہے تھے۔ وہ ان دنوں بھی پاکستان کے آئین کے خدوخال پر کام کر رہے تھے۔ اسی دوران وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کراچی آئے۔ انہوں نے یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ زیارت چلے گئے اور وہیں سے انہوں نے آخری پیغام عید اور پیغام یوم آزادی دیا۔

11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ وہ جب ائیرپورٹ سے باہر آئے تو انہیں اسٹریچر سمیت ایمبولینس میں سوار کیا گیا جو راستے میں خراب ہوگئی۔ دوسری ایمبولینس کے آنے میں کچھ وقت لگا۔ سخت گرمی اور حبس زدہ ماحول میں محترمہ فاطمہ جناح سخت پریشانی کے عالم میں اپنے پیارے بھائی کو ہاتھ کے پنکھے سے ہوا دے رہی تھیں۔ ایمبولینس کی خرابی سے ایک غلط فہمی نے جنم لیا کہ یہ قائداعظم کو قتل کرنے کی سازش تھی۔

قائداعظم کے سوانح نگار رضوان احمد نے اس واقعے کی اصل حقیقت اپنی کتاب ''میرے قائداعظم'' میں یوں بیان کی ہے:

''قائداعظم نے زیارت میں محترمہ فاطمہ جناح کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگر میں کراچی اپنے پاؤں پر جانے کے لائق ہوں تو ائیرپورٹ پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے استقبال کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن اگر میری صحت اس کی اجازت نہ دے اور میں اسٹریچر پر کراچی لے جایا جاؤں تو کسی قسم کا عوامی یا حکومتی استقبال کا بندوبست نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب قائداعظم کو زیارت سے کوئٹہ بذریعہ ہوائی جہاز کراچی لانے کی تیاری شروع ہوئی تو محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کی ہدایت کے مطابق نہ تو وزیراعظم اور ان کی کابینہ کو اطلاع کی اور نہ ہی دیگر انتظامیہ کے افراد کو۔ کراچی میں قائداعظم کے ملٹری سیکرٹری کرنل نولس کو ٹیلی فون پر ہدایت کی کہ قائداعظم کے لیے ماری پور ائیرپورٹ پر ایمبولینس کا بندوبست کیا جائے۔ غالباً اسے یہ بھی ہدایت ہوگی کہ اس کا انتظام وہ خود کرے اور حکومت کو اس کی خبر نہ ہو۔ کرنل نولس نے جو نادانی کی وہ یہ تھی کہ صرف ایک ایمبولینس کا انتظام کیا، حالانکہ وہ ملٹری سیکریٹری تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ایسے وقت میں دو ایمبولینس کا انتظام ضروری تھا۔ جب ایمبولینس خراب ہوگئی تو دوسری ایمبولینس کے انتظام تک قائداعظم غنودگی کے عالم میں ایمبولینس میں لیٹے رہے۔''

اسی رات قائداعظم محمد علی جناح کراچی میں انتقال کر گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس موقع پر کہا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جناح اتنی جلدی مرجانے والے ہیں تو میں اختیارات کی منتقلی میں اور تاخیر کردیتا۔''

قائداعظم کے انتقال کے فوری بعد وزیراعظم لیاقت علی خان نے سید ہاشم رضا کو طلب کیا جو کراچی انتظامیہ کے سربراہ تھے۔ اس وقت وزیراعظم اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پیشانی میز پر تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیاقت علی خان نے سید ہاشم رضا کو بتایا کہ قائداعظم اب ہم میں نہیں رہے۔ اس پر ہاشم رضا نے احتجاج کیا کہ میں کراچی انتظامیہ کا سربراہ ہوں، مجھے بھی قائداعظم کے کراچی آنے کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اس پر لیاقت علی خان نے بتایا کہ خبر تو مجھے بھی نہیں تھی۔

دوسری غلط فہمی یہ پھیلائی گئی کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے درمیان آخری دنوں میں اختلافات پیدا ہوگئے تھے۔ لیاقت علی خان اخلاق کا پیکر تھے اور وہ قائداعظم کو اپنے والد کے برابر درجہ دیتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قائداعظم نے 1939ء میں جو وقف نامہ اپنی جائیداد کا لکھا تھا اس میں اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ لیاقت علی خان کا نام بھی ٹرسٹیز میں شامل کیا تھا۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد حکومت کی ذمہ داری کا بوجھ اکیلے ہی لیاقت علی کے کاندھوں پر آن پڑا جسے انہوں نے شہادت تک نبھایا۔

☆☆☆

شیراز بیٹا! کیا کر رہے ہو؟

دادا جان، اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے لاؤنج میں آئے، اور محبت پاش لہجے میں پوتے کو مخاطب کیا۔

''کام کر رہا ہوں......'' پسینے سے شرابور ماتھا آستین سے پونچھتے ہوئے، شیراز نے بڑے مصروف انداز میں جواب دیا۔

''اچھا! بھلا کیا کام کر رہا ہے، ہمارا چہیتا؟''

دادا تجاہل عارفانہ سے کہتے ہوئے، اس کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے، شیراز اس وقت کیاری میں مٹی کا گملہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا، چاروں طرف سے مٹی کا گول دائرہ ''بند'' کی صورت میں بناتے ہوئے اسے گرمی اور چلچلاتی دھوپ کی قطعاً پرواہ نہ تھی، عین گملے کے درمیان میں، ایک بالشت بھر جتنی گلاب کے پھول کی ٹہنی لہلہلا رہی تھی۔ جس پر دو گلاب کے پھول اور ایک کلی بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔

''بس دادا کام مکمل ہو گیا۔ اس نے ''نو پید'' پودے کو پانی دیتے ہوئے کہا۔

لُو سے تمتماتے سرخ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑی اور دادا جان مسکراتے ہوئے اس ننھے مالی کی پیٹھ تھپک رہے تھے۔

''اب چلے آؤ شیراز، گرمی بہت ہے۔''

دادا جان نے تیسری بار پھر کہا اور وہ ہلکا سا سر ہلاتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑا۔

''لاؤنج کی کیاری میں اپنے ہاتھوں سے میں نے پودا لگایا ہے، گلاب کا پودا۔ خبردار! جو کوئی میرے اس پودے کے قریب پھٹکا تو...... ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' دسترخوان پر بیٹھا شیراز، چھوٹے بہن بھائیوں کو دھمکی دے رہا تھا۔

''سیما! تمہیں پھول توڑنے کی عادت ہے...... اگر جو کبھی غلطی سے بھی ہاتھ لگایا ناں...... گملے کو...... تو...... خیر نہیں تمہاری...... سمجھی؟''

چمچ پکڑے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے، اس نے بہن کو تنبیہہ کی۔ دسترخوان پر موجود سب بڑوں کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

شیراز نے وہ ایک ننھا پودا لگا کر گویا اپنی دنیا ہی الگ بسا لی۔ اسکول سے آتے ہوئے، اسکول کو جاتے ہوئے، ٹیوشن، مدرسہ، کھیل، غرض ہر مصروفیت سے وقت نکال کر وہ پہروں اپنے لاڈلے پودے کو دیکھتا، اس کی نشوونما پر گہری نظر رکھتا، ہر نئی کونپل کے اُگتے ہی اس کا جوش و خروش دیکھنے والا ہوتا۔

امی، ابو، دادا سب اس کے اس قدر انہماک کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہتے، ایسے ہی ایک دن جب وہ اسکول سے واپسی پر،

حسب معمول سیدھا کیاری کی طرف لپکا، مگر اگلے ہی لمحے وہ دھاڑتا ہوا اندر برآمدے میں داخل ہوا۔

"کس کم بخت کو جرأت ہوئی...... ادھر جانے کی؟"

"کدھر؟" امی پریشانی سے کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔

"میری پھولوں کی کیاری کے پاس، کس ذلیل نے قدم دھرے وہاں؟" غصے سے اس کی نسیں اُبھری ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" امی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے پچکارتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ پوچھیں کیا نہیں ہوا؟" وہ گرجا۔

"کس بے وقوف، احمق نے...... ستیاناس کر دیا میرے پودے کا...... ہائے میرے پھول......" وہ بے چارا روہانسا ہونے کو تھا۔

شور شرابہ سن کر دادا اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ جلدی میں وہ سر پر ٹوپی رکھنا بھول گئے شاید، خیریت شیر......؟ ابھی ان کی بات درمیان میں تھی کہ وہ ٹھٹکے...... سامنے ان کے چاروں پوتے پوتیاں سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

شیراز غصے سے کھولتا ہوا...... کبھی ایک کے کان مروڑتا...... کبھی دوسرے کا بازو مروڑتا...... کبھی ایک کے بال کھینچتا...... کبھی دوسرے کو چٹکی کاٹتا۔

"مجھے بتاؤ جرأت کیسے ہوئی تم لوگوں کو...... کس نے کہا تھا، تمہیں گوڈی کرو، سارا پودا اکھاڑ کر رکھ دیا۔" وہ بے دردی سے چھوٹے شہزاد کا گال کھینچتے ہوئے دھاڑ رہا تھا، اور تمہیں...... تمہیں کس نے کہا تھا، کانٹ چھانٹ کرو میرے پودے کی......" وہ دو قدم آگے بڑھ کر ننھی سیما کی پونی گرفت میں لے چکا تھا۔

نتیجتاً بالوں پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"شیراز...... بیٹے...... شیراز......" چیخ و پکار میں دادا کی آواز دب گئی۔

"بڑے آئے مالی...... سارا برباد کر دیا میرا چمن...... مرجھائے ہوئے ہیں میرے پھول...... مگر ان گنواروں کو احساس ہو تو...... اور اس نے کیسے...... کیسے اتنا سارا پانی دے ڈالا۔ خوب صورت کیاری، دلدل میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔" وہ بائیں ہاتھ پر کھڑے بہزاد کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے چلایا۔

"شیراز!" اب کے دادا نے اسے بازو سے جھنجھوڑا۔

"انسان کی قدر و قیمت باقی اشیاء سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے۔" دادا نے درشتی سے کہتے ہوئے، اس کی آنکھوں میں جھانکا...... وہ یک ٹک دادا کے چہرے پر ناراضی کا سایہ دیکھتا رہا۔

"تم نے...... گز بھر پودے کی خاطر اپنے حقوق العباد کے لبادے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یاد رکھو! انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کی عزت، مرتبہ اور حقوق کے آگے ہر چیز ہیچ ہے، بچے پھولوں سے بڑھ کر ہیں شیراز۔" گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے، دادا نے بات جاری رکھی۔ بچوں نے اپنے تئیں پودے کو نکھارنے کی کوشش کی، گلاب کے پھول کو مزید حسن و جلا بخشنے کے لیے انہوں نے اپنے ننھے دماغ سے ننھا اور بے ضرر طریقہ اپنایا۔ بچوں نے اپنی عمر اور عقل کے اعتبار سے کچھ غلط نہیں کیا۔ غلط تم کر رہے ہو شیراز۔ تمہارا رویہ اور اخلاق غلط ہیں۔ مرجھائے ہوئے، تمہارے اندر بداخلاقی کی دلدل ہے، بے حسی نے تمہیں اس قدر اکھاڑ دیا۔"

تاسف سے سر ہلاتے ہوئے، نحیف و نزار دادا کمزور قدموں پر واپس پلٹے، اور...... شرمندگی سے عرق عرق شیراز، کو اپنے پودے سے زیادہ اپنے رویے پر دکھ ہونے لگا۔ ☆☆☆

"بلاعنوان" کے دیگر دل چسپ جملے

چلو کچھ تو شاہین باہم گفتگو ہو گی
ہے میری پرواز کا طریقہ غبارے بھی اور پرچم بھی
(محمد شناس حسین، بہاول پور)

لپکنا لٹکنا ، لٹک کر اٹکنا
جشن آزادی منانے کا ہے اک بہانہ
(محمد عبدالرافع طیب، واہ کینٹ)

طیارہ ہو یا غبارہ ہو
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا ہو
(محمد حسن عبداللہ، چکوال)

جگمگ جگمگ یہ چاند اور ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ پرچم ہمارا رہے
(علینا اختر، کراچی)

حیراں نہ ہوں انکل ، ہم اوپر بھی آ سکتے ہیں
14 اگست زمین پر نہیں آسماں پر منا سکتے ہیں
(سندس آسیہ، کراچی)

یوں فضا میں اڑتے جاؤ دوستو !
جشنِ آزادی ...... مناؤ دوستو !
(ریاض حسین قمر)

پ	ر	ع	م	ش	ر	ق	ض	ہ	ش
ی	ت	ط	م	م	ظ	ع	ا	ی	س
ا	ق	ض	غ	ع	ز	ژ	ی	ء	م
م	ب	ج	خ	ی	ک	ڑ	د	ک	ل
ج	ش	چ	د	د	غ	ص	و	ن	گ
ب	ق	ر	ڈ	ا	ت	چ	خ	ا	غ
ص	ط	ا	س	ر	ا	ر	ج	ٹ	ب
ط	س	ن	ک	ر	ب	م	ت	س	ص
گ	ل	و	ل	ا	ب	ق	ا	ط	ن
ک	م	گ	ن	ج	ی	ے	ا	ق	ک

آپ نے حروف ملا کر دس چیزوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

اسرار، خودی، پیام، مشرق، اقبال، ستمبر، جنگ، اعظم، عید، بقر

اَلْمَجِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بزرگی والا)

اَلْمَجِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو اپنے نیک بندوں پر اپنی نعمتوں کے ذریعے بہت زیادہ احسانات کرنے والا ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ بڑی بزرگی والے ہیں۔ ان کی بزرگی کے سامنے کسی کی بزرگی نہیں۔ جو مسلمان بچہ یا بچی اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی بزرگی بیان کرے اللہ تعالیٰ اسے بغیر مانگے سب کچھ عطا فرما دیتے ہیں۔

اَلْمَاجِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ
(بڑائی والا)

اَلْمَاجِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو انتہائی بزرگی اور عظمت والا ہے۔

بچے اپنے دوستوں میں، بچیاں اپنی سہیلیوں میں بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اس کی تعریف اور بزرگی بیان کریں۔ اس طرح کے جملے بنائیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو پیدا کیا۔ یہ ساری کائنات اسی نے بنائی۔ وہی ہم سب کا مالک ہے۔ زمین سے غلے پیدا کیے۔ وہی آسمان سے بارش برساتا ہے۔ چرند، پرند، ہوا، پانی، آگ سب اس نے ہمارے لیے بنائے۔ اسی نے سورج، چاند، ستارے، زمین کا نظام بنایا۔

یہ ساری نعمتیں جو ہم استعمال کر رہے ہیں اسی نے ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ جب چاہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہی عزت دیتا ہے اور وہی ذلیل کرتا ہے۔ ساری دنیا کی بادشاہت اسی کی ہے۔ اسی نے آسمان کو بغیر ستون کے بنایا ہے۔''

اسی طرح کے بول ہم آپس میں بولیں اور سنیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی بزرگی بیان کرتا ہے اسے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

بابرکت عبادت

عبداللہ آج عمرہ ادا کرنے کے بعد بہت خوش تھا۔ وہ پاکستان سے سعودی عرب عمرے کی ادائیگی کے لیے آیا ہوا تھا۔ یہ نعمت اسے نہم جماعت میں ہی حاصل ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کر رہا تھا۔ مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کرنے کے بعد اب وہ مدینہ منورہ جا رہے تھے، تاکہ روضۂ رسول ﷺ کی حاضری کی نعمت بھی حاصل ہو جائے۔

''روضہ رسول ﷺ جاؤ تو درود شریف پڑھتے ہوئے جانا۔''

اسے اپنی مسجد کے امام مولانا صادق صاحب کی بات یاد آئی، لہٰذا وہ درود شریف پڑھنے لگا:

''ابھی اس نے درود شریف مکمل کیا ہی تھا کہ اسے اپنے امام صاحب کی ہدایات پھر یاد آنے لگیں۔

''عبداللہ! درود شریف بڑی بابرکت عبادت ہے۔ یہ ہر حال میں قبول ہے۔ درود شریف کے شروع میں اَللّٰھُمَّ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

مبارک نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں، یہ نام ان سب کے برابر ہے۔ اس کے ذریعے سے دعا کرنا ایسا ہے جیسا کہ اس کے سارے ناموں کو مانگ کر دعا کرنا اور پھر درود شریف کے آخر میں دو نام "حَمِیْدٌ" اور "مَجِیْدٌ" ہیں۔ ان دونوں ناموں میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور بزرگی آ گئی کہ ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں۔"

یہ پیاری باتیں اور ہدایات یاد آتے ہی وہ بڑی توجہ اور عقیدت سے درود پاک پڑھنے لگا، پھر اس کے ذہن میں یہ حدیث بھی یاد آ گئی جو انہوں نے اس کو سنائی تھی۔

"جب تم روضہ رسول پاکؐ پر پہنچو تو یہ حدیث ذہن میں رکھنا کہ آپؐ نے فرمایا: "جو شخص مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے گا میں اسے خود سنوں گا اور جو شخص مجھ پر دور سے درود شریف پڑھے وہ مجھے پہنچایا جائے گا۔"

اس لیے خوب عقیدت سے پڑھنا، کیوں کہ تمہارے درود شریف کو حضور ﷺ خود سنیں گے۔

یہ باتیں یاد کرتا کرتا اب وہ روضہ رسول ﷺ کے بالکل سامنے تھا۔ وہ بڑی محبت اور عقیدت سے درود پاک پڑھنے لگا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے اور آپؐ پر درود شریف پڑھنے میں بہت سرور مل رہا تھا۔

یاد رکھنے کی باتیں

1- ہم اپنی مجلسوں میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی بڑائی اور بزرگی کے بول بولیں اور سنیں، جس طرح ہم نے تشریح میں بتایا ہے۔ جو چیز ہمیں بڑی دکھائی دے تو اس وقت یہ سوچیں کہ اسے یہ مرتبہ بھی تو اسی اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔

2- حضور ﷺ پر زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھیں۔ جمعے کے دن کم از کم تین سو مرتبہ درود شریف پڑھنا چاہیے۔ درود شریف ہر ایک پڑھ سکتا ہے۔

ذیل میں ایک مکمل اور مختصر درود پاک ذکر کیا جاتا ہے، اسے آپ آسانی سے یاد بھی کر لیں گے۔ وہ درود شریف یہ ہے:

"صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ"

☆☆☆

قائداعظمؒ اور دیانت داری

قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے بھی راست گوئی، دیانت داری اور اصول پسندی کی نادر مثالیں قائم کیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کسی رشتے دار کو گورنر جنرل ہاؤس میں اس بنیاد پر داخلے کی اجازت نہیں دی کہ اس نے اپنے وزیٹنگ کارڈ پر "برادر گورنر جنرل آف پاکستان" کے الفاظ چھپوا رکھے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں جب ڈاکٹروں نے انہیں زیارت سے کراچی کے کسی پرفضا مقام پر منتقل کرنے کا مشورہ دیا، تو اس مقصد کے لیے کراچی میں کسی موزوں اور مناسب مقام پر کوئی رہائش گاہ دست یاب نہ ہوئی۔ صرف ملیر میں واقع نواب بہاول پور کا محل وہ واحد جگہ تھی، جہاں قائداعظم رہائش اختیار کر سکتے تھے۔ مگر قائداعظم نے اپنے طبی معالجین کے زور دینے کے باوجود نواب بہاول پور سے اس ضمن میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے زمانے میں جب کوئی وکیل، ہائی کورٹ کا جج مقرر ہوتا تھا، تو وہ کلبوں اور عوامی محفلوں میں جانا بند کر دیتا تھا بلکہ بعض اوقات، مقامی اخبارات پڑھنے سے بھی گریز کرتا تھا کہ کہیں اس کی غیر جانب داری متاثر نہ ہو، لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے میرا نواب بہاول پور سے کچھ کہنا مناسب نہ ہو گا۔ اسی طرح قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی علامتی تنخواہ از خود صرف ایک روپیہ مقرر کی تھی تاکہ ریاست پاکستان کے تنخواہ دار فراد کی حیثیت سے ان کا تشخص برقرار رہے اور یہ محسوس نہ ہو کہ وہ بلا تنخواہ فرائض انجام دے کر ریاست پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ قائداعظم کے شخصی اوصاف، ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہمیں ان کے جذبہ ایثار اور قربانی کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنی آخری سانس تک ملک وقوم کے لیے سرگرم عمل رہے۔ یہاں تک کہ اپنی شدید بیماری کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں بدعنوانیوں کا تصور تک نہ تھا۔ ایک عام آدمی بھی دیانت دار اور ملک وقوم سے مخلص تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے موقعے پر پاکستان آنے والے سرکاری ملازمین کا تمام ریکارڈ نئی دہلی سیکریٹریٹ میں رہ گیا تھا اور یہ ریکارڈ کئی برس تک پاکستان منتقل نہ ہو سکا۔ ان سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی کا وقت آیا تو حکومت نے سرکاری ملازمین سے ان کی تنخواہوں کی تفصیلات طلب کیں اور جس نے اپنی جو تنخواہ بیان کی۔ اسی کے مطابق وہ ادا کی جانے لگی۔ پھر جب ان ملازمین کا ریکارڈ پاکستان منتقل ہوا تو حکومت نے ملازمین کی بیان کردہ تنخواہوں کا سرکاری ریکارڈ سے موازنہ کرنے کے لیے ایک خصوصی کمیٹی قائم کی، کمیٹی نے جب ریکارڈ کا جائزہ لیا تو بات سامنے آئی کہ ملازمین کی بیان کردہ اور سرکاری ریکارڈ میں ظاہر تنخواہوں میں ایک پیسے کا بھی فرق نہیں تھا۔ ☆☆☆

مگرمچھ کا شکار کیے ہوئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے تھے کہ چٹاگانگ سے مولانا خورشید احمد صاحب کا ایک خط انور میاں کے نام آیا جس میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ چندرگونہ والے ماجد میاں کو تیندوے نے پھاڑ کھایا اور اب میں چٹاگانگ سے چندرگونہ جا رہا ہوں۔ خط کا جواب چندرگونہ کے پتے پر لکھنا۔

ماجد میاں مولانا خورشید احمد صاحب کے ایک مرید تھے۔ جو ہر سال باقاعدگی سے کاروباری سلسلے میں کلکتہ آیا کرتے تھے اور مولانا صاحب کے پاس ہی قیام کیا کرتے تھے۔ جس سال وہ نہ آتے مولانا صاحب خود اجمیری گنج سے سلہٹ، ڈھاکہ، کھلنا اور چٹاگانگ میں اپنے مریدوں اور دوستوں سے ملتے ملاتے چندرگونہ پہنچ جاتے۔ ماجد میاں سیاہ رنگ کے قوی ہیکل آدمی تھے۔ نماز بھی باقاعدہ پڑھتے اور ورزش بھی باقاعدہ کرتے۔ جن دنوں وہ کلکتہ میں ہوتے تو مسجد حافظ جمال الدین صاحب کے حجرے میں میری ان سے باقاعدہ زور آزمائی ہوتی۔

میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا مگر چوں کہ بچپن سے ورزش اور سپورٹس کا شوقین تھا لہٰذا خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتا۔ ماجد میاں بہت خوش ہوتے اور سب کے سامنے میرے اس شوق کی تعریف کرتے۔

ماجد میاں کے بارے میں یہ روح فرسا خبر سن کر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور بہت دیر تک میں سکتے اور پریشانی کے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں چندرگونہ جاؤں گا اور جس طرح بھی ممکن ہوگا اس ظالم تیندوے (چیتا) سے ماجد میاں کے قتل کا بدلہ لوں گا۔ چناں چہ اسی شام میں رختِ سفر باندھ کر اجمیری گنج سے روانہ ہو گیا۔

تیسرے روز صبح سویرے میں چٹاگانگ پہنچ گیا اور پھر وہاں سے مولانا صاحب کے ایک مرید شمس الدین میاں کی جیپ کے ذریعے کالوگھاٹ پہنچا۔ کالوگھاٹ پر چندرگونہ جانے والا اسٹیمر بالکل تیار کھڑا تھا۔ شام کے چار بجے تک اسٹیمر نے مجھے چندرگونہ اتار دیا۔

چندرگونہ میں ماجد میاں کے مکان پر مولانا صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے اور جب میں نے ان کو بتایا کہ میں تیندوے کو ہلاک کرنے کا عزم لے کر آیا ہوں تو وہ گھبرا گئے اور مجھے سمجھانے بجھانے کی کوششیں کرنے لگے۔ ان کے خیال کے مطابق میں ابھی بچہ تھا اور تیندوے کے شکار کے قابل نہ تھا۔

چندرگونہ میں ماجد میاں کے تیندوے کے ہاتھوں ہلاک

ہونے کی جو تفصیل معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ماجد میاں کسی نجی کام کے سلسلے میں بذریعہ اسٹیمر کپتائی گئے تھے۔ وہاں سے ان کے چند دوستوں کی پارٹی بذریعہ جیپ چٹاگانگ واپس جانے والی تھی۔ اپنا کام ختم کر کے ماجد میاں بھی ان کے ساتھ جیپ میں سوار ہو گئے۔ کپتائی اور چندر گونہ کے درمیان ایک لہراتی بل کھاتی ہوئی کچی سڑک ہے جو دریائے کرنا فلی کے کنارے کنارے چٹاگانگ تک چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک راستے میں کئی جنگلوں، نالوں اور پہاڑیوں کو عبور کرتی ہے۔ ایک مقام پر پارٹی کے کسی آدمی کو پیشاب کی حاجت ہوئی اور وہ عین جنگل کے بیچوں بیچ جیپ رکوا کر پیشاب کرنے کے لیے اترا۔ سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ڈھلان تھی۔ جس کے آخر میں ایک نالے پر لکڑی کے تختوں کا پل بنا ہوا تھا۔ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو کر پیشاب کرنے کے لیے وہ پل سے نیچے اتر گیا۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اس کی ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ ماجد میاں اس پارٹی میں سب سے قوی ہیکل اور مضبوط دل کے آدمی تھے۔ وہ جیپ کا ہینڈل پکڑ کر تیزی سے اس طرف لپکے۔ پارٹی کے دوسرے ارکان بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ڈھلان سے اترتے ہی انہوں نے دیکھا کہ ایک قدآور خون خوار تیندوا اس آدمی کو بازو سے گھسیٹتا ہوا تیزی سے پل پرلے جا رہا تھا۔ وہ آدمی غالباً تیندوے کو دیکھتے ہی یا اس کے حملے کے فوراً بعد چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا تھا کیوں کہ اب اس میں جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ اس کی پتلون پنڈلیوں پر پھنسی ہوئی تھی اور تیندوا اس کے بازوؤں کو دانتوں میں جکڑے ہوئے گھسیٹ رہا تھا۔

ماجد میاں نے زور سے ایک نعرہ لگایا اور پھر تیر کی طرح بھاگ کر ہینڈل سے تیندوے کے جسم پر وار کیا۔ تیندوے نے اپنے شکار کو چھوڑ دیا اور ایک خوف ناک غراہٹ سے ماجد میاں پر پل پڑا۔ پارٹی کے دوسرے لوگ اس کے حملے سے اس درجہ خوف زدہ ہوئے کہ چیختے چلاتے جیپ سے بھی ایک میل ادھر بھاگ آئے۔

ٹیک کے پچھلے جنگل میں دس بارہ مزدوروں کی ایک ٹولی ایک سرکاری ٹھیکیدار کی زیرسرکردگی درخت کاٹنے میں مصروف تھی۔ وہ لوگ اپنے داؤ اور کلہاڑیاں لے کر ان لوگوں کے ساتھ ساتھ واپس آئے۔ جب یہ لوگ پل کے قریب پہنچے تو فاصلے سے ان لوگوں نے دیکھا کہ تیندوا پل پر بیٹھا ماجد میاں کی لاش کھانے میں مصروف ہے۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھا اور پل کے نیچے نالے میں کود کر گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ تیندوے کا پہلا شکار بدستور زخمی اور بے ہوش پڑا ہوا ہے اور ماجد میاں ہلاک ہو چکے ہیں۔ تیندوے نے اپنے نکیلے دانتوں اور ناخنوں سے ماجد میاں کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ ان کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور ان کی آنتیں پل پر ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ بازو اور رانوں کا گوشت غائب تھا۔ پسلی کی ہڈیاں چورا چورا ہو کر چاروں طرف بکھری پڑی تھیں مگر جیپ کا ہینڈل اس عالم میں بھی ان کی مٹھی میں مضبوطی سے دبا ہوا تھا۔

بصد مشکل اس خون میں نہائی ہوئی لاش کو ٹکڑے چادر میں لپیٹ کر چندر گونہ لائے گئے۔ بے ہوش آدمی کو اسی رات چٹاگانگ اسپتال روانہ کر دیا گیا جہاں تین روز تک مسلسل بے ہوش رہنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

مولانا صاحب کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود میں ماجد میاں کے ایک دوست کی جیپ لے کر دوسری صبح تن تنہا چندر گونہ سے کپتائی روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے مولانا صاحب نے انتہائی بے بسی کے عالم میں چائے سے بھری ہوئی ایک تھرماس، دس بارہ آلوؤں سے بھرے ہوئے پراٹھے اور خشک تلی ہوئی مچھلی کے چند قتلے ایک ٹفن کیریر میں ڈال کر میری جیپ میں رکھ دیئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میرا جوش و خروش دیکھ کر بھی چندر گونہ کا کوئی شخص میرے ہمراہ چلنے پر تیار نہ ہوا۔ ماجد میاں کی لاش دیکھ کر ان پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ سب لوگ دم بخود کھڑے میرا منہ دیکھتے رہے اور کسی نے میری رفاقت کی ہامی نہ بھری۔ صرف ماجد میاں کا چھوٹا بھائی چندر گونہ کے قبرستان تک میرے ساتھ آیا۔ ہم دونوں نے ماجد میاں کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور پھر میں اسے وہیں چھوڑ کر دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میلوں تک سڑک سنسان تھی۔ دائیں طرف کرنا فلی میں کبھی کبھار کوئی مچھیرا کشتی چلاتا ہوا نظر آ جاتا لیکن بائیں طرف حد نگاہ تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں میں تیار فصل کھڑی ہوئی تھی مگر کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ایک موڑ پر ایک جھونپڑا نظر آیا۔ میں نے جیپ روک کر آوازیں دیں، مگر وہ بھی خالی تھا۔ ایسا

محسوس ہوتا تھا کہ چندر گونہ سے لے کر کپتائی تک کوئی انسان آباد نہیں ہے۔

جیپ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بھری ہوئی رائفل میرے قریب خالی سیٹ پر رکھی تھی۔ ایک پہاڑی موڑ عبور کرنے کے بعد مجھے کرنافلی کے دوسرے کنارے پر گیروے کپڑے پہنے بدھ بھکشوؤں کا ایک گروہ نظر آیا جو سپاری کے بلند و بالا درختوں کے نیچے کھڑا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے جیپ روک کر ہاتھ ہلایا مگر وہ پتھر کے بے جان مجسموں کی طرح خاموش کھڑے میری طرف گھورتے رہے۔ غالباً اس حادثے کے بعد میں پہلا مسافر تھا جو اس سڑک پر تن تنہا گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر رکنے اور چائے کا ایک پیالہ پینے کے بعد میں نے پھر جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ بتلائے ہوئے نشانات کے مطابق اب وہ پل آنے والا تھا جہاں تیندوے نے ماجد میاں کو ہلاک کیا تھا۔ اگلا موڑ کاٹتے ہی خوف کی ایک سرد لہر میرے تمام جسم میں تیرگئی اور اعصاب پر قابو پانے کے لیے میں نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔

پیا ملن کو جانا۔ ہاں ہاں۔ پیا ملن کو جانا

پائل کو باندھ کے، اٹھی چپ نانده کے

دھیرے دھیرے، دبے دبے پاؤں کو اٹھانا

ہاں ہاں۔ پیا ملن کو جانا۔

یکا یک مجھے احساس ہوا کہ یہ گانا تو بالکل حسب حال ہے۔ اگر ''پیا'' کسی ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے ہوئے اچانک سامنے آگئے تو کیا ہوگا لہٰذا شور وغل کی بجائے دھیرے دھیرے، دبے پاؤں آگے بڑھنا چاہیے اور یہ سوچ کر میں خاموش ہوگیا لیکن میرے اعصاب بری طرح بے قابو تھے۔ اسٹیرنگ پر میرا ہاتھ لرز رہا تھا اور چاروں طرف فضا میں ایک عجیب سی بے چینی اور دہشت سی محسوس ہوتی تھی۔

اب سڑک اور دریا کے درمیان ایک گھنا جنگل حائل ہوگیا تھا۔ بائیں طرف ہرے بھرے اونچے اونچے ٹیلے تھے جن پر بے شمار جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ سڑک سانپ کی طرح لہراتی، گھومتی، جنگل اور ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ سامنے ایک سنگ میل پر تیروں کے نشان کے ساتھ کپتائی اور چٹا گانگ کے فاصلے لکھے ہوئے تھے۔ اس نشان پر پہنچ کر میں نے جیپ روک لی کیوں کہ اگلے موڑ کے فوراً بعد وہ خونی پل آنے والا تھا اور اس پل پر گزرنے سے پہلے میں اپنے اعصاب پر قابو پانا چاہتا تھا۔ میں نے تھرماس کھول کر چائے کے چند گھونٹ پیئے۔ سگریٹ سلگایا اور پھر جیپ پر کھڑا ہو کر چاروں طرف بغور دیکھنے لگا۔

ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ دائیں طرف درختوں کے جھنڈ کے نیچے کرنا فلی کا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ بائیں طرف ٹیلوں پر پھول ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اور سامنے اس موڑ کے پار خونی پل تھا۔ جہاں ایک بہادر انسان نے اپنے دوست کی جان بچانے کے لیے خوف ناک تیندوے سے دست بدست جنگ کی تھی اور زندگی کے آخری کٹھن سانس لیے تھے۔ معاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ماجد میاں کی روح میرے آس پاس موجود ہے اور مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ میں اپنے دل کے کانوں سے اس کی آواز سن رہا تھا۔

''شاباش بیٹے! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ آج تمہیں میرا انتقام لینا ہے ہمت سے کام لو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔''

پھر جیسے میرے اعصاب اعتدال پر آگئے ہاتھوں کی لرزش تھم گئی اور دل جو پہلے کسی انجانے خوف سے لرز رہا تھا مضبوط ہوگیا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر رائفل اپنی گود میں رکھ لی اور جیپ کو اسٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ موڑ گھومتے ہی ڈھلان شروع ہوگئی اور اس خونی پل کا جنگلا نظر آنے لگا۔ موڑ گھومتے ہی ڈھلان شروع ہوگئی اور اس خونی پل کا جنگلا نظر آنے لگا۔ میں انتہائی چوکنی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے جیپ کا انجن بند کر دیا اور جیپ بغیر آواز کے رینگتی ہوئی پل کے قریب آئی۔ پھر پل کے تختوں پر چلنے لگی۔ میرا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا اور دوسرا رائفل کے کندھے پر۔ پل کے تختے جیپ کے وزن سے کھڑکھڑانے لگے اور پھر گھنی جھاڑیوں میں کسی جانور نے جست لگائی اور پل کے نیچے ایک گڑھے میں کود گیا۔ یہ تیندوا نہیں تھا، کچھ اور تھا۔ غالباً جنگلی بلی یا لومڑی کی قسم کا کوئی چھوٹا جانور ہوگا۔

پل کے وسط میں پہنچ کر میں نے جیپ روک لی۔ رائفل ہاتھوں میں تھام کر نیچے اترا اور تختوں کو بغور دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہاں ماجد میاں کے لہو کے نشانات اب بھی موجود ہوں گے مگر تختے بالکل صاف تھے۔ ....(باقی آئندہ شمارے میں)

انسان تو یہ تھا

ساجد کمبوہ

جے ڈبلیو گرائمر اسکول کی چھٹی کلاس کا ایک منظر۔ بچے ٹیسٹ کی بنیاد پر اس کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ ایک انگلش میڈیم اسکول سے آٹھ بچے اور ایک ''دی ٹرسٹ'' اسکول سے آئے پانچ بچے۔ دوسرے اسکولوں اور سرکاری سے آئے بچوں پر مشتمل کلاس بنی۔ انگلش میڈیم اسکول سے ایک بچے نے 85 فیصد نمبر لیے تھے اس کے قریب ''دی ٹرسٹ'' اسکول کے بچے رمضان نے 82 فیصد نمبر لیے تھے۔ انگلش میڈیم اسکول کے بقایا سات بچوں کے نمبر رمضان سے کم تھے۔ انہیں اس پر بہت طیش تھا۔ عمران بڑے جارحانہ انداز میں دی ٹرسٹ کے بچوں کو لتاڑ رہا تھا۔ ''خیراتی اسکول سے پڑھ کر آنے والے ہمارا مقابلہ کریں گے...... ہونہہ مانگے تانگے اور صدقہ و خیرات پر چلنے والے اسکول کے بچے۔'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''دی ٹرسٹ'' کے بچے چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ عمران کی دیکھا دیکھی دوسرے بچے بھی شروع ہو گئے۔ چوں کہ ان کے نمبر تھے لہٰذا انہیں اس بات کا غصہ تھا۔ عمران جوئیہ ان کا سرغنہ بن گیا اور سب ان پر آوازیں کسنے لگے۔ بھوکے ننگے، غریب غربا...... ہم سے مقابلہ۔ دی ٹرسٹ اسکول کے بچوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسی زبان بول رہے ہیں۔ ہم فیس بھی دیتے تھے، ہماری یونی فارم، شوز، وقت کی پابندی اور انگلش میڈیم سلیبس تھا، ٹائمنگ بھی وہی تھی پھر یہ مانگے تانگے اور صدقہ و خیرات والے الفاظ کا ہم سے کیا تعلق......؟

انہیں دیکھ کر عمران جوئیہ گروپ اور بھی شیر ہو گیا، وہ بلند آوازوں سے انہیں معتوب کرنے لگا۔ سر وحید راؤنڈ پر تھے۔ انہیں اس کمرے سے غیر معمولی شور سنائی دیا، وہ جلدی سے اس کمرے کی طرف بڑھے۔ دیکھا کہ چار پانچ بچوں کو کچھ بچوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ ان بچوں کے گرد کھڑے تھے، وہ بچے سہمے بیٹھے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سر وحید نے اچانک پوچھا۔ انہیں دیکھ کر بچے جلدی سے ڈیسکوں پر بیٹھ گئے۔ ''کچھ نہیں سر! ...... وہ...... ہم...... ذرا گپ شپ کر رہے تھے۔'' عمران گڑبڑا کر بولا۔

''گپ شپ کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ شاید آپ کے علم میں نہیں کہ جے ڈبلیو ڈسپلن کے معاملے میں اپنی مثال آپ ہے۔ صرف ٹیچرز کے پڑھانے کی آواز آنی چاہیے۔ یہ شور و غل، گپ شپ، بازاروں، بس اسٹاپ یا مچھلی مارکیٹ میں اچھی لگتی ہے۔ بتائیے کیا بات ہے؟'' سر وحید نے پوچھا۔

''سر...... وہ...... سر جی......'' ایک دی ٹرسٹ کا بچہ اٹھا۔ ''سر!......'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''سر! یہ لڑکا ہمیں کہہ رہا ہے کہ ہم خیراتی اسکول سے پڑھ کر آئے ہیں۔ صدقات و خیرات والے اسکول......'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

”اف!“ سر وحید نے ماتھے پر ہاتھ مارا، اس کا مطلب ”دی ٹرسٹ“ کو مانگے تانگے اور خیرات والا اسکول سمجھ رہے ہیں۔“ ”سر! ٹرسٹ والے اسکول، ڈسپنسریاں یا اسپتال صدقات و خیرات کے لیے اشتہارات نہیں دیتے۔ وہ زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں کے لیے اپلیں نہیں کرتے؟“ عمران جوئیہ نے کہا۔

”ارے بھئی! آپ سمجھے نہیں۔ جس طرح آپ کا یہ اسکول ”جے ڈبلیو“ یہ ہم دو دوستوں نے مل کر بنایا ہے۔ جے سے ’جاوید‘ صاحب اور ”ڈبلیو“ سے میرا نام یعنی ’وحید‘ ہے۔ یہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارا ذریعہ معاش بھی ہے۔ یعنی ہم نے تعلیم کو ذریعہ معاش بنایا ہے۔ بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے کاروبار کہہ لیں زیادہ مناسب ہو گا۔ جس طرح میڈیکل سٹورز ہوٹل، جنرل و پرچون کی دکانیں، باٹا و سروس کی شاپس، موٹر بائیک، کار کے شو روم کاروبار کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے کاروبار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حضرات فیس لے کر چیک اپ کرتے ہیں اور میڈیسن دیتے ہیں سمجھے کہ نہیں؟“

”جی سر! سمجھ گئے اور ٹرسٹ...... صدقہ و خیرات......؟؟؟“

”ارے بھئی! ٹرسٹ ایسے ادارے کو کہتے ہیں جیسا کہ ”دی ٹرسٹ“ فرض کر لیں یہ ”احیاالعلوم“ والوں کا اسکول ہے۔ ٹرسٹ ایسے ادارے کو کہتے ہیں جو "No lose no profit" کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ یعنی وہ منافع نہیں لیتے، کاروبار نہیں کرتے۔ اگر ہم ایک ہزار فیس لیتے ہیں ٹیچرز، ملازمین، چوکیدار، گن مین، کلرکوں، پانی و بجلی کا خرچہ نکال کر منافع آپس میں بانٹ لیتے ہیں جب کہ ٹرسٹ کچھ مخیر حضرات مل کر چلاتے ہیں۔ وہ مناسب فیس و داخلہ فیس لیتے ہیں۔ وہ فالتو خرچہ برداشت کرتے ہیں۔ یہ تو نیکی کا کام ہے۔ اس سے وہ گھرانے جو غریب ہوتے ہیں یا بھاری فیسیں برداشت نہیں کر سکتے، وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں معتوب کیوں کہا جاتا ہے؟ اب اس طرف آؤ۔ ایک میموریل ڈسپنسری یا اسپتال بنتا ہے۔ وہاں خدمت اور ثواب کی نیت سے ایک فیملی یا ایک ادارہ اس کا خرچہ برداشت کرتا ہے۔ وہاں ڈاکٹرز، نرس اور دوسرا عملہ، ان کا انتظام، دوائیوں (بلڈنگ اگر اپنی نہ ہو) کرایہ وغیرہ ان کی ذمہ داری ہے، وہ بہت معمولی پرچی فیس کے عوض چیک اپ اور میڈیسن دیتے ہیں۔ کیا ان دوائیوں سے مریض صحت یاب نہیں ہوتا......؟“

”ہوتا ہے سر! ہمارے محلے میں ایک میموریل ڈسپنسری ہے، وہاں روزانہ ساٹھ ستر مریض دوائی لیتے ہیں صرف بیس روپے پرچی کے عوض کبھی ستر سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں......“

”کیا آپ ان لوگوں کو بھی طعنہ دینے لگو گے کہ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس ہزار بارہ سو کی دوائی لینے کیوں نہیں جاتے؟“ سر وحید کا مخاطب عمران جوئیہ تھا۔

”سر!...... ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ...... یہ...... کہ......“

”میرا خیال ہے کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی۔ آپ کو ٹرسٹ اور میموریل کا پتا نہیں تھا۔ میموریل اپنے کسی پیارے، عزیز، باپ، والدہ، بیٹے یا بھائی کے نام پر بنائی جاتی ہے۔ ڈسپنسری ہو یا اسپتال پہلے ٹرسٹ تھے اور اب بھی ہیں۔ جیسے لاہور کا یتیم خانہ بھی ٹرسٹ ہے اور تو اور علی گڑھ کالج یونیورسٹی بھی پہلے ٹرسٹ ہی تو تھا۔“

”سوری سر! واقعی ہمارے علم میں نہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ صدقات و خیرات اور زکوٰۃ لینے والے اسکول ٹرسٹ کہلاتے ہیں اور اس میں غریب غرباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہم اس لیے انہیں طعنہ دے رہے تھے۔“ عمران جوئیہ نے کہا۔

”آپ انگلش میڈیم سے آئے ہیں۔ لازمی ہزار روپے فیس ہو گی اور یہ ٹرسٹ کا پڑھا بچہ...... غالباً رمضان نام ہے اس کی فیس پانچ سو کے قریب ہو گی۔ آپ سے چند نمبر کم ہیں پھر یہ حقیر کیسے ہو گیا؟ جب کہ آپ کے اسکول کے 60 بچے اس سے پیچھے ہیں۔“ سر وحید نے دیکھا کہ عمران جوئیہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دوسرے بچے بھی شرمندہ دکھائی دے رہے تھے اس پر سر وحید نے کہا۔ ”ابھی میں نے کل ہی نیٹ پر ایک عظیم شخص کی داستان پڑھی ہے۔ کل اس کا پرنٹ لاؤں گا۔ اس شخص کی قربانی بے مثال ہے۔ اس نے آپ جیسے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنی دولت اور صحت قربان کر دی۔ کیا آپ ان بچوں کو معتوب کرو گے کہ وہ کسی کی ادا کردہ فیس سے پڑھے ہیں؟؟ چلو رمضان اور دوستوں سے معذرت کرو۔“

عمران جوئیہ پہلے ہی شرمندہ تھا لہٰذا فوراً اٹھا اور رمضان اور دوسرے لڑکوں کی طرف بڑھ گیا۔ جلدی سے گلے لگا کر سوری کہا۔ انہوں نے فراخ دلی سے معاف کر دیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ جب سر وحید جانے لگے تو عمران جوئیہ نے کہا۔ ”سر! یاد سے کل اس کا پرنٹ لائیں تاکہ ہمیں بھی پتا چلے کہ اس عظیم شخص نے کیا

قربانی دی۔" سر وحید نے او کے کہا اور کلاس روم سے نکل گئے۔

اگلے دن بچوں کو بے تابی سے سر وحید کا انتظار تھا۔ وہ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ دیکھیں سر وحید کون سی داستان سناتے ہیں۔ اظہر نے کہا۔ "ویسے تو سر وحید چاہتے ہیں کہ ٹیچرز زیادہ سے زیادہ بچوں کو پڑھائیں۔ آج کوئی خاص بات کہانی ہوگی جو سنانے کا وعدہ کیا ہے۔" "تمہیں کیسے پتا چلا؟" عبداللہ نے پوچھا۔ "میرا بڑا بھائی بھی یہاں پڑھتا رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ پڑھائی اور ڈسپلن کے معاملہ میں جے ڈبلیو..... " سر وحید روم میں داخل ہوئے۔ تمام بچے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ "سٹ ڈاؤن پلیز!" انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"ہاں تو بچو! آپ کو یقیناً اس عظیم انسان کی داستان کا انتظار ہوگا۔ صرف اس لیے آپ کا وقت لے رہا ہوں کہ بہت سے بچوں اور لوگوں کو ٹرسٹ اور میموریل کے بارے میں غلط فہمیاں ہیں، وہ بھی دُور ہو جائیں گی کیوں بھئی عمران؟؟"

"جی..... جی سر! ویسے میں شرمندہ ہوں۔" میری غلط فہمی سے میرے بھائیوں کی دل آزاری ہوئی۔

"وہ ایک سائیکل رکشہ ڈرائیور تھا۔ وہ ستر سال سے زائد عمر کا تھا۔ اتنی محنت و مشقت کرتا کہ اس کے ہاتھ سن ہونے شروع ہو گئے تھے اور ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں۔ لگتا تھا کوئی سوکھی لکڑی ہے جو کسی بھی وقت چٹخ جائے گی مگر بھاری بھرکم سواری کو چوں کہ منزل پر پہنچانا ضروری تھا۔ اس لیے "بائی فانگی" جیسے تیسے سائیکل رکشہ کے پیڈل گھماتا جا رہا تھا۔ پیڈل گھماتے ہوئے اس نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کی عمر اور صحت اس قابل نہیں رہی کہ وہ سارا دن سائیکل رکشہ پر سواریاں کھینچتا رہے۔ سواریاں اس کی صحت اور بڑھاپا دیکھ کر اس کے رکشے میں بیٹھنے سے اجتناب کرنے لگی تھیں۔ اس لیے اپنی پھولتی ہوئی سانسوں اور ٹوٹتے ہوئے جسم کے ساتھ آج اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ قبل اس کے کہ وہ کمزوری اور تھکاوٹ کی وجہ سے کسی سڑک پر سائیکل رکشہ اور اس میں بیٹھی ہوئی سواری سمیت گر جائے، اب اسے یہ سب چھوڑ کر اپنے گاؤں لوٹنا ہوگا تاکہ اب تک جو اس نے کمایا ہے، اس سے اپنی باقی ماندہ زندگی آسانی سے گزار سکے۔ جہاں اس کا اپنا ایک کھلا کھلا سا جھونپڑا نہ جانے کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے سواری کو اس کی منزل پر پہنچایا، وہ خالی رکشہ لیے سیدھا ٹھیکیدار کے پاس پہنچا اور سائیکل اس کے حوالے کرتے ہوئے آئندہ کام کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنے گاؤں جانے کی اجازت مانگی۔

74 سالہ سائیکل رکشہ کھینچنے والا "بائی فانگی" ٹرین میں بیٹھا ہوا اپنے گاؤں کی فضاؤں کا منظر اپنی نظروں کے سامنے لا کر پرانی یادوں کو کریدتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب 1984ء کا سال شروع ہو چکا ہے۔ اتنے برسوں بعد وہ اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ نہ جانے اس کے گاؤں کے وہ سب ساتھی اب کیسے ہوں گے؟ گاؤں کا موجودہ منظر کیسا ہوگا؟ وہ اپنے خیالوں میں اپنی نئی زندگی کے منصوبوں کے بارے میں سوچتا ہوا جب اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گاؤں کے بہت سے بچے کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ بچے اس وقت اپنے اسکول میں کیوں نہیں ہیں؟ اس نے ان کے پاس رک کر پوچھا کہ تم اس وقت کھیتوں میں کیوں کام کر رہے ہو؟ اسکول کیوں نہیں گئے؟ پہلے تو بچوں نے اس بوڑھے کو پہچاننے کی کوشش کی جب ناکام رہے تو دوبارہ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بوڑھے بائی فانگی نے دوبارہ ان سے جب یہی سوال پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے والدین جو ہمیں ایک وقت کی روٹی بڑی مشکل سے کھلا رہے ہیں ہمارے اسکول کی فیسیں اور دوسرے اخراجات کہاں سے ادا کریں گے؟ یہ جو ہم کھیتوں میں کام کر رہے ہیں اس سے تو ہم اپنے لیے ایک وقت کی خوراک بھی بمشکل حاصل کر پاتے ہیں....." سر وحید یہاں رک گئے انہوں نے بچوں کی طرف دیکھا جو بت بنے ان کی طرف دیکھ رہے تھے لگتا تھا دور خلاء میں بائی فانگی کو دیکھ رہے تھے۔

بوڑھا فانگی کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا، پھر زمین پر رکھی ہوئی اپنی گٹھڑی اٹھا کر کمر پر لادی اور سیدھا اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اسے سلام کرنے کے بعد اس نے ایک بچے کے کل ماہانہ تعلیمی اخراجات کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو وہ سمجھا شاید یہ اپنے پوتے یا نواسے کو اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہے لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ اکیلا ہے اور گاؤں کے بچے کھیتوں میں کام کرتے ہیں ان کو تعلیم دلوانا چاہتا ہے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ماہانہ

تعلیمی اخراجات بارے تفصیل سے بتایا۔ یہ معلومات لینے کے بعد اس نے اپنے پاس جمع پونجی اسکول کی انتظامیہ کے حوالے کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس کے کھیتوں میں کام کرنے والے سب بچوں اور ان کے والدین کو بلا کر کہا جائے کہ ان کے تعلیمی اخراجات میں برداشت کروں گا۔ وہ تعلیم حاصل کریں۔ اس وقت ان سب کی ایک سال کی فیسیں اور کتابوں سمیت دوسرے اخراجات کی رقم پیشگی ادا کر رہا ہوں۔

بائی فانگی واپس تیانجن شہر سائیکل رکشہ ٹھیکیدار کے پاس گیا اور اس سے دوبارہ کام کرنے کی درخواست کی۔ اس کی ایمانداری اور اچھے اخلاق کی وجہ سے ٹھیکیدار نے اسے دوبارہ سائیکل رکشہ کرائے پر دے دیا۔ اب کی بار "فانگی" نے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی کمرہ کرایہ پر لے لیا اور دن رات رکشہ کھینچنے لگا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے گاؤں کے بچوں کو مزدوری نہیں کرنے دے گا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ محنت مزدوری کرے گا اور بچوں کو تعلیم دلوائے گا۔ اس نے پہلے کی نسبت سادہ غذا کھانی شروع کر دی اور بارہ گھنٹے کی بجائے بیس گھنٹے کام شروع کر دیا۔ شوخ لباس پہننا شروع کر دیا تاکہ سواریاں اسے بوڑھا سمجھ کر نظرانداز نہ کریں۔ روزانہ سائیکل رکشہ سے جو کماتا اس سے اپنے گاؤں کے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرتا۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ سولہ برس گزر گئے اور جب وہ نوے برس کی عمر کو پہنچا تو اس کے جسم پر سوائے ہڈیوں کے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ سائیکل رکشہ چلانا تو بہت دُور کی بات اس سے اب سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے سائیکل رکشہ ٹھیکیدار کو واپس کیا۔ واپس اپنے گاؤں آیا۔ سیدھا یاؤوا مڈل پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا اور ان بچوں کے اسکول کی فائنل فیس ادا کرنے کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگی کہ اب وہ مزید خدمت نہیں کر سکتا۔ یہ میری طرف سے آخری اسکول فیس ہے جو ادا کر رہا ہوں امید ہے کہ آپ سب مجھے معاف کر دیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا۔ اسکول کے اساتذہ نے اسے اٹھایا۔ بچے بائی فانگی کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگے۔" سر وحید رکے...... بچوں کی طرف دیکھا جو ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے جیسے کسی فلم میں فانگی جیسا کردار دیکھ رہے ہوں۔

کچھ دیر بعد سر وحید نے گلا صاف کیا اور دوبارہ کاغذ پر تحریر پڑھنے لگے۔

"بائی فانگی نے 1987ء سے 2001ء تک اپنے گاؤں کے تین سو بچوں کے تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پندرہ سالوں میں کل تین لاکھ پچاس ہزار اسکول فیس اور کتابوں کے لیے ادا کیے...... 2005ء میں فانگی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم تین سو بچوں کی صورت میں ایک شان دار اور باوقار میراث چھوڑتے ہوئے اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

میں جب فانگی کے بارے میں یہ سب پڑھ رہا تھا تو مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا۔ یہ سائیکل رکشہ ڈرائیور جوان پڑھ تھا۔ جسے نئے کپڑے اور خوراک کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے قربانی دے کر پندرہ سال تک 300 بچوں کی اسکول فیسیں اور دوسرے اخراجات برداشت کیے، وہ بچے نہ اس کے رشتہ دار تھے نہ اولاد میں سے تھے۔ کیا آپ ان بچوں کو معتوب کریں گے جو ایک شخص کی ادا کردہ فیسوں اور اخراجات سے پڑھے؟؟"

سر وحید کی آنکھیں بھی نم تھیں، اس شخص کے لیے جس کی قربانیوں نے ایک کثیر تعداد میں بچے پڑھائے۔ اسے ٹرسٹ کہتے ہیں جسے بائی فانگی جیسا انسان سپانسر کر رہا تھا۔ ایسی نیکی کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔"

"سر!" ابوبکر نے کہا۔ "آپ کا تو اسکول کیا آپ بھی...... فانگی کی طرح...... میرا مطلب ہے......" "میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ ہم اس مقدس پیشہ سے منسلک ہیں۔ ہمارا مشن صرف کمائی نہیں ہے ہم بھی درد رکھتے ہیں۔ بہت سے ایسے بچے ہیں جن کی ساری فیس معاف ہے، کچھ سے نصف۔ کتابوں کا اور یونیفارم کا انتظام بھی کرتے ہیں نہ ہی ان کا نام ظاہر کرتے ہیں کیوں کہ عزتِ نفس بہت بڑی دولت ہے۔ ہم صرف ان بچوں سے اور تمام بچوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ محنت سے پڑھیں اور ملک کا نام روشن کریں۔"

"سر! کوئی پیغام دینا چاہیں......" محمد موسیٰ نے کہا۔

"سب سے یہی اپیل ہے کہ وہ کم از کم ایک بچے کے تعلیمی اخراجات برداشت کریں۔ چند ڈبیا سگریٹ، پان سے بچت کریں، اعلیٰ ہوٹلنگ کا دو وقت کا کھانا اور لانگ ڈرائیو سے چند لیٹر پٹرول بچا کر نیکی کا یہ چراغ روشن کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامل مسلمان بنائے۔ آمین! یہ کہہ کر سر وحید روم سے باہر نکل گئے۔ ☆☆☆

اچھے طالب علم کی خصوصیات

ایک اچھے طالب علم میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ اس کی شخصیت مکمل نہ ہوگی۔

1- خوفِ خدا
2- بحیثیت مسلمان نبی کریمؐ کی محبت، اطاعت اور عظمت کا جذبہ۔
3- قوم سے محبت، وطن سے وفاداری اور اسلامی حکومت کی تابع داری۔
4- روز کا کام وقت پر کرے، جماعت میں خوب توجہ سے لیکچر سنے اور سکون کے ساتھ بیٹھے۔ استاد کے ساتھ اطاعت، ہمدردی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔
5- اوقات نامہ (Time Table) بنا کر اس کی پابندی بھی کرے۔
6- ورزش کو معمول بنائے اور کھیل کے میدان میں تمام ضابطوں کی پابندی کرے۔
7- وقت پر سوئے، وقت پر جاگے، اعتدال سے کھائے، ادب سے بولے اور بدزبانی سے پرہیز کرے۔
8- اپنے والدین اور خاندان کی امیدوں اور آرزوؤں کا خون نہ کرے۔
9- بزرگوں کا احترام کرے۔
10- زندہ دلی اور مسکراہٹ کو اپنا شعار بنائے۔
11- اپنے ساتھیوں کے حقوق کا خیال رکھے اور لڑائی جھگڑے سے گریز کرے۔
12- بغیر اجازت کے نہ تو جماعت سے باہر جائے اور اس طرح نہ ہی جماعت کے اندر داخل ہو۔
13- استاد کی طرف سے دی گئی ذمہ داریوں کو خوبی سے پورا کرے۔
14- اپنے تعلیمی ادارے کے وقار کے منافی کوئی حرکت نہ کرے اور اپنے اساتذہ کے لیے فخر کا باعث بننے کی پوری پوری کوشش کرے۔
15- اس بات کا خیال رکھے کہ وہ ایک مسلمان طالب علم ہے اور خاص کر ایک باوقار تعلیمی ادارے سے اس کا تعلق ہے۔
16- مدرسے اور اسکول میں وقت کی پابندی کو اپنا شعار بنائیں اور مقرر کردہ وقت میں حاضری دے اور اس کے ساتھ ساتھ کتابیں کاپیاں صاف ستھری رکھے۔ اپنے بال، ناخن، لباس اور ہاتھ پاؤں صاف ستھرے رکھے۔

(حفصہ اعجاز، بازہ ہملٹ، ضلع صوابی)

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2017ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2017ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

ستمبر کا موضوع ''یوم دفاع'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 ستمبر 2017ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

میری زندگی کے مقاصد

اللہ داد، سدھانو رپور تھل
میں بڑا ہو کر پروفیسر بنوں گا اور غریبوں کو مفت تعلیم دوں گا۔

مائرہ شاہد، رائے ونڈ
میں نیورو سائنس دان بن کر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے مشن کو پورا کروں گی۔

عبدالواسع، لاہور
میں بڑا ہو کر پاک فوج میں جاؤں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

حدیبیہ، نارووال
میں ٹیچر بن کر بچوں کا مستقبل روشن کرنا چاہتی ہوں۔

حانیہ رضا، لاہور
میں ان شاء اللہ ڈاکٹر بن کر اپنے والدین اور اپنے ملک پاکستان کا نام روشن کروں گی۔

فاطمہ زہرا، راولپنڈی
میں بڑی ہو کر عالم دین بنوں گی اور دین کی خدمت کروں گی۔

وکیل عباس، رحیمیا نوالہ
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

سلیمان یوسف کمبوہ، علی پور
میں ادیب، شاعر اور ڈاکٹر بن کر اپنے وطن پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

شیر باز، صادق آباد
میں بڑا ہو کر کرکٹر بن کر اپنے والدین اور ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

پاکیزہ نور، مریدکے
میں بڑی ہو کر آرمی ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے والدین اساتذہ اور اپنے پیارے ملک کا نام روشن کروں گی۔

عبدالرحمٰن، لاہور
میں بڑا ہو کر آرمی میں جاؤں گا۔

محمد عرفان، سدھانو رپور تھل
میں بڑا ہو کر ایک اچھا ٹیچر بنوں گا اور غریبوں کو مفت پڑھاؤں گا۔

محمد عمیس اقبال، جہانیاں
میں بڑا ہو کر سول انجینئر بنوں گا۔

صارم خان، لاہور
میں بڑا ہو کر ایس ایس جی کمانڈو بن کر ملک کو دہشت گردی سے پاک کروں گا۔

عمیر یونس، لاہور
میں بڑا ہو کر صدر پاکستان بنوں گا اور غریب عوام کی مدد کروں گا۔

طیب رسول، صفدر آباد
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کو دشمنوں سے بچاؤں گا۔

اقصیٰ رباب، لاہور
میں کالج کی لیکچرار بن کر طالبات کو زیور تعلیم سے آراستہ کروں گی۔

امان اللہ خان، ڈی جی خان
ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد صفی الرحمٰن، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

سکندر نعمان، سدھانو رپور تھل
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سائنس دان بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

ثاقب فرید گھلو، اٹھارہ ہزاری
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد عارف، اٹک
میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بن کر سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

برہان طاہر، لاہور
میں ان شاء اللہ ڈاکٹر بن کر اپنے والدین اور اپنے ملک پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

محمد عثمان محمود، اوکاڑہ
میں بڑا ہو کر پاک فوج میں شمولیت اختیار کر کے اپنی زندگی سے بڑھ کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد حذیفہ علی، کوٹ سلطان
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملکی سرحدوں کا دفاع کروں گا۔

بہتر کون

ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی رات کے وقت معمول کے مطابق گشت پر تھے۔ ایک تندور کے پاس کسی کو سویا ہوا دیکھا تو اس کو اٹھا کر پوچھا کہ وہ کون ہے؟

آدمی: میں ایک غریب مزدور ہوں اور دن بھر مزدوری کر کے اسی تندور کے پاس سو جاتا ہوں۔

سلطان: اس سردی میں رات کیسے گزرتی ہے؟

مزدور: آدھی آپ کے انداز میں اور باقی آدھی رات آپ سے زیادہ اچھے انداز میں۔

سلطان: حیرت سے، وہ کیسے؟

مزدور: جب تک تندور گرم رہتا ہے تو آپ جیسی نیند سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ جو آپ کے مقابلے میں بہتر ہے۔ (عریشہ ماہم، پشاور)

صبح کی نماز

سیدنا سلمانؓ، سیدنا ابوبکرؓ کی عیادت کے لیے آئے۔ آپؓ موت کی کشمکش میں تھے۔ سیدنا سلمانؓ نے عرض کیا۔ ''اے خلیفہ رسولؐ! مجھے وصیت کیجئے۔'' آپؓ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ تم پر دنیا کے دروازے کھولے گا لیکن تم اس میں سے بقدر ضرورت لینا اور یہ کہ جو شخص صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے تو وہ اللہ کی پناہ میں ہو جاتا ہے لہٰذا تم اس کو مت چھوڑنا ورنہ اوندھے منہ دوزخ میں جاؤ گے۔'' (زینب فاطمہ عباسی، پشاور)

اقوال زریں

☆ زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

☆ اے اللہ! ہمارے دیدۂ دل کو ان باتوں سے نابینا کر دے، جو تیری محبت کے خلاف ہیں۔ (امام زین العابدین)

☆ اگر ہم اپنے فرائض ادا کرنا شروع کر دیں تو ہمارے حقوق کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا کیوں کہ ہمارے فرائض دوسروں کے حقوق ہیں۔

☆ توبہ کا خیال خوش بختی کی علامت ہے کیوں کہ جو اپنے گناہ کو گناہ نہ سمجھے وہ بدقسمت ہے۔ (سعد اللہ، حویلی لکھا)

وقت کی پابندی

قائداعظمؒ وقت کی بڑی پابندی اور قدر کرتے تھے اور وقت ضائع کرنے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ یکم جولائی 1947ء کو اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کی تقریب میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وزراء اور سرکاری افسران کی کرسیاں خالی پڑی ہیں کیوں کہ یہ لوگ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ قائداعظمؒ نے حکم دیا کہ خالی کرسیاں وہاں سے ہٹا دی جائیں تاکہ دیر سے آنے والے وزیر اور افسر کھڑے ہو کر تقریب سنیں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ دیر سے آنے والے افسران اور وزیروں نے کھڑے ہو کر تقریر سنی۔ قائداعظمؒ کے انہی اعلیٰ اصولوں کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔

(مائرہ شاہد، راولپنڈی)

دوست

☆ دوست ایک انمول تحفہ ہے اس کی قدر کرو۔

☆ ہر ہاتھ ملانے والا شخص دوست نہیں ہوتا۔

☆ دوست سے حسد نہ کرو۔

☆ دوست وہ ہے جو مشکل وقت میں کام آئے۔

☆ دوست چاہے کتنا ہی برا ہو جائے اسے مت چھوڑو کیوں کہ پانی چاہے کتنا ہی گندا ہو آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔

☆ دوست کی تعریف سب کے سامنے اور اسے نصیحت تنہائی میں کرو۔

(حفصہ نثار)

پڑوسی کا حق

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسولؐ ایک فلاں عورت اپنی نمازوں، روزوں اور صدقات کی وجہ سے بہت مشہور ہے لیکن وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، تو آپؐ نے فرمایا۔ ''ھی فی النار'' وہ عورت جہنمی ہے۔'' اس نے عرض کی یا رسول اللہؐ فلاں عورت

نمازوں، روزوں اور صدقات کی قلت کے حوالے سے مشہور ہے کہ وہ پنیر کے چند ٹکڑے صدقہ کرتی ہے لیکن اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی تو پیارے نبی حضرت محمدؐ نے فرمایا: "ھی فی الجنة" وہ عورت جنتی ہے۔ (ناظرہ مقدس، شیخوپورہ)

انمول باتیں

☆ نیکی پر غرور کرنا اس کا اجر ضائع کر دیتا ہے۔
☆ پہلے وہ کام شروع کرو جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔
☆ گناہ گار دنیا کا دیوانہ ہوتا ہے اور نیک آدمی آخرت کا۔
☆ مسکراہٹ دنیا کی سب سے خوب صورت زبان ہے۔
☆ اچھے الفاظ سے اچھے جملے بنتے ہیں اور اچھے جملوں سے اچھا اخلاق بنتا ہے۔
(سرمد شہریز، راولاکوٹ)

عشرۂ ذی الحجہ

☆ ماہ ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں کو عشرۂ ذی الحجہ کہتے ہیں۔
☆ جو شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد بال، ناخن کٹانے اور حجامت بنوانے سے دسویں تاریخ تک رکا رہے۔
☆ بقرعید کی ماہ کی پہلی تاریخ سے لے کر نویں تاریخ تک ہر دن کا روزہ رکھنا ایک ایک دن کا روزہ ثواب میں سال بھر کے روزوں کے برابر ہے اور نویں تاریخ یعنی عرفہ کے دن کا روزہ کا ثواب دو سال کے روزوں کے ثواب کے برابر ہے۔
☆ پورے سال میں پانچ دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ عید الفطر کے دن اور چار دن ذی الحجہ کے یعنی 10، 11، 12، 13 ذی الحجہ کے روزے۔
☆ تکبیرات تشریق: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ 9 ذی الحجہ کی نماز فجر سے لے کر 13 ذی الحجہ کی عصر کے نماز کے بعد تک ہر فرض نماز کا سلام پھیرتے ہی ایک مرتبہ بلند آواز سے ان تکبیرات کا کہنا واجب ہے۔ البتہ عورتیں آہستہ پڑھیں گی۔ (شامی)

وضاحت: بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں۔ اس تکبیر کو پڑھتے نہیں یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ مردوں کے لیے درمیانہ طریقہ سے بلند آواز سے پڑھنا ضروری ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ (بارہ مہینوں کے فضائل ص 229)
(محمد طیب طوفانی، سرائے نورنگ)

ماں کی خدمت

حضرت بایزید بسطامیؒ اللہ کے پیارے ولی تھے۔ آپ اپنی والدہ کی خدمت کو سب سے بڑی عبادت اور ان کی رضامندی کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت جانتے تھے۔ ایک رات والدہ نے ان سے پانی مانگا۔ حضرت بایزیدؒ پیالہ لے کر پانی لینے گئے۔ صراحی کو دیکھا تو وہ خالی پڑی تھی۔ کسی اور برتن میں بھی پانی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر آپ دریا کی طرف چل دیئے۔ اس رات سخت سردی پڑ رہی تھی۔ جب آپ دریا سے پانی لے کر واپس آئے تو والدہ سو چکی تھیں۔ حضرت بایزیدؒ پیالہ لے کر والدہ کی پائنتی کی طرف کھڑے ہو گئے۔ سردی کی وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر آپ نے اپنی تکلیف کا کچھ خیال نہ کیا اور پانی کا پیالہ لیے چپ چاپ کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد آپ کی والدہ کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ آپ پانی کا پیالہ لیے کھڑے ہیں۔ والدہ نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر کہنے لگیں: "بیٹے، تم نے اتنی تکلیف کیوں اٹھائی پانی کا پیالہ میرے بستر کے قریب رکھ دیتے۔ میں اٹھ کر خود پی لیتی۔"

حضرت بایزیدؒ نے جواب دیا۔ "آپ نے مجھ سے پانی مانگا تھا۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ جب آپ کی آنکھ کھلے تو کہیں میں آپ کے سامنے حاضر نہ ہوں۔"

والدہ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور انہیں دعائیں دینے لگیں۔
(کظیمہ زہرہ، لاہور)

قربانی کا بکرا

جوں ہی عید قریب آئی ساتھ بچوں نے رٹ لگائی
بکرا میاں کب آئے گا؟ بکرا میاں کب آئے گا؟
پھر جب ابو بکرا لائے سارے بچے دوڑے آئے
کھیلا بھی، کھلایا بھی سنبھالا بھی، دوڑایا بھی
عید الاضحی کا دن آیا ساتھ ڈھیروں خوشیاں لایا
جب بکرا قربان ہوا تو بچوں کا دل ٹوٹا
ہیں نادان سارے بچے اے بچو! بڑے ہیں سچے
تمہارا بکرا ہے نرالہ ...... جس کو تم نے پیار سے پالا ......
قربانی کی راہ پہ ڈالا اب اللہ ہے اس کا رکھوالا
رب کے ہاں تو صبر چلے گا تم کو اس کا اجر ملے گا

(کاوش: ایمان مجتبیٰ ملک، فیصل آباد)

موٹر کار کے وائپر کس نے ایجاد کیے؟

موٹر کار میں، ڈرائیور کی سیٹ کے سامنے ایک شیشہ لگا ہوتا ہے جو ڈرائیور کو تیز ہوا اور بارش وغیرہ سے بچاتا ہے۔ اس شیشے کو انگلینڈ کی انگریزی میں "ونڈ اسکرین" اور امریکا کی انگریزی میں "ونڈ شیلڈ" کہتے ہیں۔ اردو میں آپ اسے "ہوا روک" کہہ سکتے ہیں۔

جب یہ ونڈ اسکرین بارش، مٹی یا برف سے دھندلا جاتی ہے اور ڈرائیور کو سامنے کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں تو وہ ایک خاص بٹن دباتا ہے، جس سے ونڈ اسکرین پر لگے ہوئے دو "ہاتھ" دائیں بائیں گھوم کر اسے صاف کر دیتے ہیں۔ ان ہاتھوں کو انگریزی میں وائپر (Wipers) کہتے ہیں۔ اردو میں صافی کہہ لیجیے۔

آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ موٹر کار کس نے ایجاد کی تھی، لیکن یہ معلوم نہ ہوگا کہ وائپر کس نے ایجاد کیے تھے۔

یہ آج سے 90 سال پہلے (1902ء) کی بات ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایک ریاست، الاباما، میں ایک عقل مند عورت رہتی تھی۔ اس کا نام میری اینڈرسن تھا۔ ایک دن وہ اپنی کار میں نیویارک جا رہی تھی کہ راستے میں بارش نے آلیا جس سے کار کی ونڈ اسکرین دھندلا گئی۔ ان دنوں ایسی صورت میں ڈرائیور کار روک کر نیچے اترتا اور کپڑے سے ونڈ اسکرین صاف کرتا۔ لیکن اس طرح وہ بارش میں بھیگ جاتا تھا۔ میری اینڈرسن کو بھی سارے راستے نیچے اتر اتر کر ونڈ اسکرین صاف کرنا پڑی جس سے اسے ٹھنڈ لگ گئی۔

گھر آ کر وہ سوچنے لگی کہ ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ کار کا ڈرائیور اندر ہی بیٹھے بیٹھے ونڈ اسکرین صاف کرتا رہے۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے کاغذ پر وائپر کا خاکہ بنایا، لوہار کے پاس گئی، اسے خاکہ دکھا کر دھات کے دو وائپر بنوائے اور انہیں کار کی ونڈ اسکرین کے باہر فٹ کر دیا۔ پھر کار کے اندر اسٹیرنگ کے پاس ایک ہینڈل لگایا اور اسے دونوں وائپروں کے ساتھ جوڑ دیا۔ وہ ہینڈل گھماتی تو وائپر دائیں بائیں حرکت کرتے اور ونڈ اسکرین صاف ہو جاتی۔ اس طرح وہ بارش اور برف باری میں کار سے باہر نکلنے کی مصیبت سے بچ گئی۔

میری نے اپنی اس ایجاد کو حکومت سے پیٹنٹ کروایا (یعنی اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس طرح کے وائپر بنا کر فروخت نہیں کرے گا) اور چند سال بعد جب یہ وائپر ہاتھ کے بجائے بیٹری سے چلنے لگے تو میری کی چاندی ہو گئی۔ اس کے بنائے ہوئے وائپر تمام ملک میں بکنے لگے اور 1953ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے وائپر ساری دنیا میں استعمال ہو رہے تھے اور وہ کروڑ پتی بن چکی تھی۔

☆☆☆

اقلیدس

آپ یونان کے مشہور و معروف ریاضی دان و مفکر تھے۔ انگریزی میں آپ کو "Euclid" لکھا جاتا ہے۔ آپ کو" فادر آف جیومیٹری" بھی کہتے ہیں۔ آپ حضرت عیسیٰؑ سے 350 سال لگ بھگ قبل پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنا علمی و تعلیمی عرصہ مصر میں

گزارا۔ اصول اقلیدس (Elements) آپ کی خاص تصنیف ہے جس میں ریاضی کے تھیورمز ثابت کیے گئے ہیں۔ آپ کی وفات کے ہزاروں سال بعد تک اصول ریاضی جو اقلیدس کے وضع کردہ تھے دنیا بھر میں پڑھائے جاتے رہے۔ مسلمانوں میں عباسی دور میں اقلیدس کے اصولوں کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ ریاضی میں مروج لفظ "Data" ڈیٹا اور "Calculus" اور "Optics" وغیرہ کا تصور سب سے پہلے آپ نے دیا۔ اقلیدس کی زندگی پر کتب بھی لکھی ہیں لیکن آپ کے بارے میں سو فی صد معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

شمالی کوریا کا پرچم

شمالی کوریا (North Korea) مشرقی ایشیاء کا ملک ہے۔ چین، جاپان اور جنوبی کوریا اس کے پڑوسی ممالک ہیں۔ شمالی کوریا کا سرکاری نام ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا ہے۔ پیانگ یانگ (Pyongyang) اس کا دارالخلافہ ہے۔ یہ ملک میزائل سازی میں خاص نام رکھتا ہے۔ اس ملک کے پرچم کو

"Ramhongsaek Gonghwagukgi" کہتے ہیں۔ یہ بات شمالی کوریا کے آئین کے آرٹیکل 170 میں درج ہے۔ اس پرچم کو 8 ستمبر 1948ء کو پہلی بار متعارف کروایا گیا۔ پرچم کا درمیانی حصہ سرخ ہے۔ جس کے اوپر اور نیچے سفید پٹی بنی ہے۔ جب کہ سفید پٹی کے اوپر اور اسی طرح نچلے حصے میں چوڑی نیلی پٹی ہے۔ پرچم کے سرخ حصہ میں 5 کونوں والا سرخ ستارہ بھی موجود ہے۔ سرخ ستارہ کمیونزم اور سوشلزم کی علامت ہے۔
نیلی پٹیاں اتحاد، امن اور دوستی کی علامت ہیں۔ جب کہ سفید دھاریاں پاکیزگی وسچائی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ شمالی کوریا کی فوج کے دفتر پر 270 کلو وزنی اور 160 میٹر لمبا پول لگا ہے۔ جس پر شمالی کوریا کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔

کروز میزائل

کروز میزائل (Cruise Missile) ایک گائیڈڈ (Guided) میزائل ہے جو فضا سے برق رفتاری کے ساتھ دشمنوں کے اثاثوں کو نشانہ بناتا ہے۔ 1932ء سے 1939ء کے عرصہ میں روس نے امریکی تنصیبات کو تباہ کرنے کے لیے اس قسم کے میزائل بنانا شروع کیے۔ کروز میزائل ایک گائیڈنس نظام، پے لوڈ اور ایئرکرافٹ پروپلشن نظام رکھتا ہے۔ اس کے دو پر (wings) ہوتے ہیں اور یہ ایٹمی وار ہیڈ لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ روس اور امریکہ کے پاس 3 سے 4 ہزار کلو میٹر دور تک چلائے جانے والے کروز میزائل ہیں۔ بھارت کا براہموس II کروز میزائل 300 کلو میٹر دور تک دشمن کو تباہ کرسکتا ہے۔ جب کہ پاکستان کا کروز
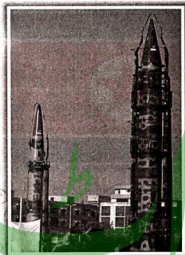
میزائل بابر 700 کلو میٹر تک دشمن کے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس میزائل کو حتف VII بھی کہتے ہیں۔ بابر میزائل کی رفتار 550 میل فی گھنٹہ ہے۔ اس میزائل کا وزن 1500 کلوگرام اور لمبائی 6.25 میٹر ہے۔ روسی کروز میزائل RKV-500 امریکی کروز میزائل BGM-9، چینی کروز میزائل DF-10/CJ وغیرہ دنیا کے جدید ترین کروز میزائل ہیں۔ ایران اور شمالی کوریا بھی یہ ٹیکنالوجی رکھتے ہیں۔

عالمی یوم ریبیز

عالمی یومِ سگ گزیدگی یا "World Rabies Day" دنیا کے 120 ممالک میں اقوام متحدہ کے تحت ہر سال 28 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا مقصد کتے وغیرہ (Dog) کے کاٹنے سے انسانوں میں پیدا ہونے والی بیماری "Rabies" سے متعلق عوامی شعور بیدار کرنا ہے کیوں کہ کتے کے کاٹنے سے انسانی خون میں ایک وائرس منتقل ہو جاتا ہے۔ جسے "Rabies Virus" کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک سے تین ماہ میں انسانوں کے اندر ریبیز کی علامت شروع ہو جاتی ہیں۔ بخار، سر درد، دماغ میں سوزش، بے چینی،

اعضاء کا سن ہو جانا، بے خوابی، خوف زدہ رہنا، بے ہوشی وغیرہ اس کی علامات ہیں۔ اس کے لیے علاج کروانا پڑتا ہے لہٰذا پالتو جانوروں کی ویکسین بھی دستیاب ہے۔ "Rabies" کی بیماری حضرت عیسیٰ کی ولادت سے 2000 سال قبل بھی موجود تھی۔ ریبیز کا لفظ لاطینی زبان کا ہے جس کا مطلب ہے ''پاگل پن'' یعنی سگ گزیدگی۔ کتوں کے علاوہ، ریچھ، بلی، بھیڑیے، اونٹ، گائے، گدھے، چوہے، سور وغیرہ کے کاٹنے سے بھی یہ مرض ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں کس شہر کو عروس البلاد کے نام سے پکارا جاتا تھا؟

i۔ تہران ii۔ بغداد iii۔ تبریز

2۔ سندباد جہازی کس ممتاز ادیب اور شاعر کا قلمی نام ہے؟

i۔ احمد ندیم قاسمی ii۔ چراغ حسن حسرت iii۔ اشفاق احمد

3۔ عالم اسلام کا مقدس پہاڑ جبل ثور، مکہ معظمہ سے کتنے فاصلے پر ہے؟

i۔ 4 میل ii۔ 5 میل iii۔ 6 میل

4۔ عام حالات میں انسانی خون کا دباؤ کتنا ہوتا ہے؟

i۔ 90/80 ii۔ 100/80 iii۔ 120/80

5۔ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ کون سا ہے؟

i۔ نیوگنی ii۔ گرین لینڈ iii۔ بافن آئی لینڈ

6۔ کس مسلمان سائنس دان نے سب سے پہلے کیمیائی تجربہ گاہ قائم کی؟

i۔ بوعلی سینا ii۔ البیرونی iii۔ جابر بن حیان

7۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کون سے پہاڑ پر ٹھہری تھی؟

i۔ کوہ طور ii۔ کوہ ارارات iii۔ کوہ مروا

8۔ انقرہ ترکیہ کا دارالحکومت ہے، یہ کب ملک کا دارالحکومت بنایا گیا؟

i۔ 1922ء ii۔ 1923ء iii۔ 1924ء

9۔ بھنبھور کے آثار قدیمہ پاکستان کے کس ضلع میں واقع ہیں؟

i۔ دادو ii۔ ٹھٹھہ iii۔ نواب شاہ

10۔ علامہ اقبالؒ کا شعر بال جبریل سے لیا گیا ہے مکمل کیجیے۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر ....

جوابات علمی آزمائش اگست 2017ء

1۔ سید امیر الدین قدوائی 2۔ چراغ سحر 3۔ عبدالکریم چھاگلہ 4۔ ایک منٹ 20 سیکنڈ 5۔ 13 اگست 1954ء 6۔ کوئی زبان نہیں 7۔ 14 جنوری 1900ء 8۔ لاہور 9۔ چوہدری رحمت علی 10۔ 10 ہزار

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ سعدیہ حلیمہ، اسلام آباد (150 روپے کی کتب)

☆ فاطمۃ الزہرا، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ محمد داؤد، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد شاہ میر لودھی، فیصل آباد۔ محمد مجیر خان، ڈیرہ غازی خان۔ زینب وقار، سیال کوٹ۔ فاطمہ عزیز، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ عائشہ قمر، گوجر خان۔ فاطمہ احمد، راول پنڈی۔ ایقہ عزیز، میانوالی۔ جویریہ اشرف آرائیں، کبیر والا۔ احمد اللہ ورک، لاہور۔ فرحان ظفر، سرگودھا۔ انوشہ فاطمہ، لاہور۔ مدثرہ خلیل، دینہ۔ مشعال آصف، لاہور۔ یمنٰی تنویر، کلور کوٹ۔ نور صفیہ اشفاق، لاہور۔ مریم ملک ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ تحیقہ عزیز، میانوالی۔ سارہ ارشد، سرگودھا۔ ملک انس ثاقب، گوجرانوالہ۔ حفصہ شفیق، میانوالی۔ ولید اشرف، لاہور۔ عائشہ شہباز، بورے والہ۔ تابعہ احسان، ملتان۔ محمد حسان، سرگودھا۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ ازکیٰ تحریم، میانوالی۔ محمد صہیب علی، کراچی۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ لائبہ کنول، پشاور۔ فاطمہ اختر، راول پنڈی۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ فاخر زمان، کرک۔ سارہ جاوید، لاہور۔ طلحہ خباب علی، تلہ گنگ۔ منزہ بتول، گجرات۔ شائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ عروبہ امین، کراچی۔ مصباح صدف مبشر، جھنگ۔ علینا اختر، کراچی۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ وردا زہرہ، جھنگ۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ ردا فاطمہ، خالدی ہاؤس۔ اقصیٰ خالد، اسلام آباد۔ ہانیہ آصف، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ ردا اقبال کہوٹ، راول پنڈی۔ مقصود اختر، لاہور۔ عبدالمعز اسلم خان، پشاور۔ طلحہ قطب، لاہور۔ تطہیر زہرہ، اسلام آباد۔ وردہ الیاس، جھنگ۔ مبین سعید، گوجرانوالہ۔ عبدالمغنی وقاص، بہاول پور۔ عبداللہ اسلم، لاہور۔ ماہ رخ، حیدر آباد۔ مطیع اللہ بلوچ، جڑانوالہ۔ حمنہ شاہد، اسلام آباد۔ خواجہ اویس احمد، آزاد کشمیر۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ عروبہ عاصم، لاہور۔ عائزہ وحید، سارہ وحید، آزاد کشمیر۔ محمد شبیر عباس، لاہور۔ ضوبیہ خان، فیصل آباد۔ اقراء شمس، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مریم منیر، چونیاں۔ عزیر رائے احمد، کمالیہ۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ رائقہ، فیصل آباد۔ محمد احمد، ڈیرہ غازی خان۔ کائنات فاروقی، راول پنڈی۔ قیصر علی، لاہور۔

سالار، خالہ کے ہاں سے آیا تو بہت چپ چپ تھا۔ ماں نے دیکھا تو پوچھا۔ ”بہت خاموش ہو، کیا بات ہے؟“

”امی! نے آج مجھے بڑی ڈانٹ پلائی۔“ وہ شرمندہ ہو کر بولا۔

”بہت اچھا کیا! تم نے جو اتنا بڑا جھوٹ بولا اور سارے خاندان میں ان کے بیٹے کے فیل ہونے کی جھوٹی خبر پھیلا کر انہیں اس قدر پریشان کیا، بھلا یہ تمہیں کیا سوجھی؟“ ماں نے خفا ہو کر کہا۔

سالار نادم ہو کر بولا: بس حماقت ہو گئی، دوستوں کے کہنے میں آ کر اپریل فول بنانے کی غلطی ہو گئی۔“

”پھر بات کہاں ختم ہوئی......، تم نے خالہ سے معافی مانگی؟“ امی نے پوچھا۔

”معافی کیا، میں تو سب کے سامنے اس قدر نادم ہوا کہ جی چاہتا تھا قریب کوئی دریا ہو تو ڈوب کر مر جاؤں۔“ سالار نے رقت بھری آواز میں کہا۔

”دریا پر ہی کیا موقوف ہے، ان حالات میں تو ڈوب مرنے کو چلو بھر پانی ہی کافی ہے......!!“ سالار کی بہن زریں نے ہنس کر کہا۔

”وہ کیسے؟“ سالار نے چونک کر پوچھا۔

وہ ایسے کہ چلو میں پانی لو اور اس میں اپنی ناک ڈبو دو۔ بس کام ہو جائے گا!!“ بہن نے مذاق سے کہا تھا مگر سالار سنجیدگی سے بولا: ”ویسے بات تو ٹھیک ہے، آزمائش شرط ہے!“

یہ سن کر امی، زریں پر خفا ہونے لگیں: ”کیا فضول بات ہے۔ کیسی خطرناک حرکت سمجھا رہی ہو اس احمق کو؟“

امی جان! میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی۔ زریں نے گھبرا کر جواب دیا۔ سالار کی بہن نے تو مذاق ہی کیا تھا مگر ہے دراصل یہ محاورہ۔ جب کوئی شخص ناقابل برداشت حرکت کرتا ہے تو اسے شرمسار کرنے کے لیے یہ محاورہ کہا جاتا ہے، شرم کرو! چلو بھر پانی میں ڈوب مرو!

☆☆☆

اوقات ممالک

جب پاکستان میں دوپہر کے 12 بجتے ہیں تو دنیا کے مختلف ممالک میں درج ذیل وقت ہوتا ہے:

1- افغانستان میں دوپہر کے 11:30 بجتے ہیں۔
2- بھارت میں دوپہر کے 12:30 بجتے ہیں۔
3- چین میں دوپہر کے 3:00 بجتے ہیں۔
4- بنگلہ دیش میں دوپہر کے 1:00 بجے کا وقت ہوتا ہے۔
5- سعودی عرب میں صبح کے 10 بجتے ہیں۔
6- ترکی میں صبح کے 9:00 بجتے ہیں۔
7- جاپان میں صبح کے 4:00 بجتے ہیں۔
8- کینیڈا میں اگلے دن رات کے 2:00 بجے کا وقت ہوتا ہے۔

(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

میں ایک بکرا ہوں۔ میرا نام چٹو ہے۔ میرے دس سالہ مالک ارسلان عرف سنی نے غالباً...... نہیں یقیناً یہ نام میری گوری چٹی رنگت کی وجہ سے رکھا۔ میرے برعکس کالو...... ایک تو رنگت کالی، دوسرا میرے ساتھ کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کی پرسنیلٹی مزید ڈاؤن ہو جاتی ہے۔ کالو کا مالک بھی اس کا ہم رنگت...... ظہیر ہے، جو کہ میرے مالک کے نوکر کا بیٹا ہے۔

گو کالو میرا دور پرے کا رشتہ دار لگتا ہے ہم دونوں کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر کوئی بھی یہ بات نہیں مان سکتا کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ ہم دونوں کی مائیں بھی کم و بیش شکل و صورت میں ہماری طرح ہی تھیں۔ ہاں ''تھیں'' دراصل ہماری پیدائش کے کچھ ماہ بعد ہی عید قربان آ گئی پہلے پہل مجھے اس عید کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ عید کے روز جب مالکان ہماری ماؤں کو ہم سے دُور لے گئے اور کچھ ہی دیر بعد مجھے میری ماں کی چیخیں سنائی دیں تو میں نے غم کی شدت سے رونا شروع ہو گیا۔ تب مجھے کالو نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ خالہ جانی (میری اماں) کے لیے یہ سعادت کی بات ہے۔ ان کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یاد میں قربان کیا جا رہا ہے۔ مجھے لگا کہ شاید کالو مجھے بہلانے کی غرض سے ایسا کہہ رہا ہے مگر کچھ دیر میں جب اس کی اپنی اماں کی چیخیں سنائی دیں، تب وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اس روز وہ دعا کرتا رہ کہ ''اے میرے اللہ! مجھے بھی بقر عید پر قربان ہونے کی سعادت ملے۔'' اس دن سے میرے دل میں بھی یہی دعا خواہش بن کر پلنے لگی۔ ویسے بھی اس عظیم الشان قربانی کے لائق کالو نہیں، میں تھا۔

میں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا، میرا حسن اور نکھار بڑھتا گیا جب کہ کالو میری نسبت مزید گہناتا گیا۔ گو ہمارا قد کاٹھ اور باڈی فزیک (body physique) قریباً ایک ہی جیسی تھی مگر کیا کہنے حسن و رنگت کے، جو میری خوب تر اور اس کی کم تر ہو رہی تھی۔

وہ کیا کہتے ہیں، خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے میں بے حد نخریلو ہو گیا۔ سنی سے خوب ''لاڈیاں'' کرتا۔ گھاس بھی اس کے ہاتھوں سے کھاتا، زمین سے گھاس اور چارہ کھانا میرے شایان شان نہ تھا۔ میرے برعکس کالو نہایت ہی دبو، خاموش اور صابر تھا۔ بھلا اس بے چارے کے پاس ناز نخرے کرنے کو تھا ہی کیا!

اس طرح ایک سال گزر گیا اور عید قربان نزدیک آن پہنچی۔ میں نہایت پر جوش اور خوش تھا کہ اللہ کی راہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پوری کرتے ہوئے میں قربان کیا جاؤں گا۔ میں اکثر کالو کا مذاق اڑاتا کہ ''تمہاری قربانی کوئی نہیں کرے گا۔'' کالو

جواباً خاموش رہتا، کہتا بھی کیا بے چارہ!

پھر ایک دن ہمارا مالک ہمیں منڈی لے گیا۔ اپنے گھر قربانی کرنے کے لیے وہ اس بار بیل لے آیا تھا۔ منڈی پہنچ کر مجھے بہت مزہ آیا۔ ہر خریدار مجھے محبت اور حسرت سے دیکھتا۔ ان میں سے زیادہ تر میرے پاس آتے اور مجھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے۔ نوجوانوں کی اکثریت تو میرے ساتھ سیلفیاں بھی بنواتی۔ اس کے بعد انہوں نے فیس بک پر یقیناً یہ جھوٹ بولنا تھا کہ انہوں نے ''چٹو'' خرید لیا۔ ونہہ! مجھے خریدنا ہر ایک کے بس کی بات تھوڑی ہے۔ بہرحال میں سیلفیوں میں ان کو بھرپور ''پوز'' دیتا اور ان کے جانے کے بعد خوب ''میں میں'' کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرتا۔ جب کہ بے چارہ چپ چاپ کھڑا رہتا۔

پھر اگلے دن ایک مال دار خریدار آیا۔ اس سے پہلے آنے والے خریدار میرا بھاؤ سن کر ہی بھاگ جاتے۔ میرے مالک نے اس امیر آدمی کو میرا ساٹھ ہزار جب کہ کالو کا ریٹ پینتالیس ہزار بتایا۔ یہ سن کر میرا خون سیروں بڑھ گیا اور کالو کا منہ اتر آیا۔

''کیوں بھئی! قیمت مختلف کیوں ہے؟ صرف رنگ کا ہی تو فرق ہے۔'' خریدار کا یہ جملہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ بھئی ''class'' اور ''Personality'' بھی کوئی شے ہے۔

''او بابا! یہ چٹو پہاڑی نسل کا ہے۔ یہ زیادہ گوشت نکالے گا۔'' گو میرے مالک نے جھوٹ بولا تھا مگر میں سرشار ہو گیا۔ میں نے کالو کو آنکھ ماری...... بے چارہ کالو!

اب ان خریداروں نے میرے اور کالو کے دانت چیک کرنے شروع کیے۔ اف...... اوہ! مجھے اتنا غصہ آیا، دل کیا کہ اسے کاٹ لوں، پھر سوچا کہ اگر انہوں نے غصے میں مجھے خریدنے سے انکار کر دیا تو میری عزت نفس بری طرح مجروح ہو گی۔ یہ سوچ کر چپ چاپ دانت چیک کرا دیے۔

خریداروں کو دو بکرے خریدنے تھے۔ ایک بقرعید پر قربان کرنے کے لیے اور دوسرا اپنے آٹھ ماہ کے بھتیجے کے لیے صدقہ کی غرض سے قربان کرنے کے لیے۔ وہ بچہ ملیریا بخار کی وجہ سے نہایت سخت بیمار تھا لہٰذا خریداروں نے ریٹ بھاؤ طے کرنے کے بعد میرے مالک کو ایک لاکھ روپے تھمائے اور ہم دونوں کو لوڈر پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ نئے مالکان اور ان کے بچے ہم دونوں اور خصوصاً مجھے دیکھ کر بے پناہ پرجوش ہوئے۔

نئے مالکان کے نو اور بارہ سالہ دونوں بیٹوں نے مجھے چنا۔ ان میں سے کوئی بھی کالو چننے پر تیار نہ تھا۔ سرونٹ کوارٹر کے سامنے کھڑا بچہ تو کب سے دونوں بچوں کو میرے ساتھ کھیلتے دیکھ رہا تھا، چپ چاپ کالو کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ میرے کلیجے پر گویا ٹھنڈ پڑ گئی۔ کالو ہمیشہ نوکروں کے بچوں کے لیے ہی بچتا ہے!

خیر میرے کلیجے پر اس وقت ڈگی ٹھنڈ پڑی جب مجھے پتا چلا کہ سب گھر والوں نے مل کر مجھے یعنی چٹو کو بقرعید جبکہ کالو کو صدقے کے لیے قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرے پاؤں زمین پر نہ ٹھہرتے۔ بھئی میں تو شروع سے کہتا ہوں کہ اتنی بڑی قربانی کے قابل میں ہوں، کالو نہیں!

اگلے روز شام کے وقت دونوں بچوں ٹیپو اور ریان نے لان میں ہی میچ کھیلنا شروع کیا۔ مالی کے بیٹے عبدل کو انہوں نے ''وکٹ کیپر'' بنایا۔ پاکستان انڈیا کرکٹ میچ میں پاکستان کی حالی کامیابی کی وجہ سے ان کے کھیل میں کافی جوش تھا۔ ان کو پانچ پانچ اوورز کھیلنے تھے۔

ریان (بڑے) نے پہلے بیٹنگ کر کے (خود کو فخر زمان سمجھتے ہوئے) پورے پچیس رنز کا ہدف دیا۔ یہ پچیس کے پچیس رنز ''بھاگ'' کر بنائے گئے تھے۔ اب ٹیپو صاحب کی باری آئی۔

ریان ''ٹیپو کو بلی! نہیں ہو گا تجھ سے chase'' گنگناتے ہوئے فخریہ انداز میں باؤلنگ کرانے جا رہا تھا۔ آخری 5 اوورز میں پچیس رنز بنانے آسان تھوڑی ہیں۔

ریان کی پہلی ہی بال اتنی تیز تھی کہ بلے کو چھوئے بغیر آگے نکل آئی۔ عبدل نے خود کو حسن علی سمجھتے ہوئے بال کو پکڑنا چاہا مگر بال اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی...... ہوتی ہوئی...... میری ٹانگ پر...... اف!! بہت زور سے لگی۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلایا۔ میری آواز سن کر گھر کے سبھی افراد بھاگے بھاگے آئے۔ دو لوگ میری ٹانگ کا معائنہ کرنے لگے جب کہ بچوں کا چھوٹا چاچو گیند کو دیکھ کر چلایا۔

''میری ہارڈ بال ملی تھی کھیلنے کو! اس بال سے تو چٹو کی ٹانگ کا ستیاناس ہو گیا ہو گا۔'' بے چارہ چٹو۔ چھوٹے چاچو نے ترحم بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

یہ سن کر میری تکلیف اور بڑھ گئی (اتنی ہمدردی جو مل رہی تھی) خیر میری ٹانگ پر پٹی باندھ دی گئی۔ صبح تک زخم قدرے بہتر تھا۔ درد کی شدت میں بھی کمی تھی۔ مگر میں...... ذرا لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میں نے دیکھا، میرے مالکان کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔ پھر ان میں سے کسی ایک نے خون کال ملائی۔ فون پر بات کرنے کے بعد فون بند کر کے جیب میں ڈالا اور پاس کھڑی بیوی سے بولا۔

''مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ لنگڑے بکرے کی قربانی نہیں ہوسکتی۔''

اس کی بیوی نے پریشان کھڑے شوہر کو تسلی دیتے ہوئے میری تو جان ہی نکال دی۔

''آپ فکر مند نہ ہوں۔ ہم بقر عید پر کالے بکرے کو ذبح کر لیتے ہیں اس چٹو کو ایک ہفتے بعد منے کے صدقے کے لیے قربان کر دیں گے۔''

اس بات پر گھر کے بھی لوگ متفق تھے۔ میں روتا رہا، چلاّتا رہا مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور تھا! میں نے کالو کو دیکھا، اس کے چہرے پر فتح یا غرور کے کوئی اثرات نہ تھے۔ وہ اپنی ازلی عاجزی کے ساتھ کھڑا تھا۔

ہاں! پھر میں نے جان لیا۔ یہ اس کا صبر ہی تھا جس نے اس کو اتنی بڑی قربانی کی سعادت بخشی تھی اور مجھے میرا غرور لے ڈوبا۔ حق ہا!

اگلے روز کالو کو قربان کیا جا رہا تھا۔ سب بچے رو رہے تھے مگر میں ان کو کیسے بتاتا کہ پیارے بچو! کالو رو نہیں رہا تم کو اس کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں مگر دراصل یہ الحمدللہ، الحمدللہ کا ورد کرتے ہوئے قربان ہو رہا ہے...... اللہ کی راہ میں...... حضرت ابراہیمؑ کی سنت میں......

میں بے حد مغموم تھا مگر پھر خیال آیا، ابھی تو میرے پاس ایک ہفتہ ہے نا! تو میں اس دوران اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکتا ہوں نا! بے شک وہ بے حد غفور و رحیم ہے۔ وہ یقیناً مجھے بھی بخش دے گا۔ پھر جب اگلے ہفتے اس کی راہ میں قربان کیا جاؤں گا تو میں بھی کالو کی طرح الحمدللہ کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے پیارے دوست کالو کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ان شاء اللہ!

☆☆☆

اقبال کی حاضر جوابی

ایک دفعہ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اہلِ ذوق دور دور سے مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر علی گڑھ کے چند مقامی شعراء نے علامہ کو پریشان کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے ایک مصرع منتخب کر کے علامہ کو اس پر گرہ لگانے کے لیے کہا۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں، ہرن پانی میں

علامہ اقبال ایسے بکھیڑوں سے پرہیز کرتے تھے، تاہم لوگوں کے بے حد اصرار پر یہ مصرعہ لگا کر مکمل کر دیا۔

اشک سے دشت بھریں ، آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ، ہرن پانی میں

(محمد احمد، لاہور)

میجر کو پڑی پر پھرتے ہوئے برکی سے شمال کی سمت کھجور ایریا میں ایک پلاٹون کی نفری نہر کی جانب آتی دکھائی دی۔ وائرلیس سے میسج پاس کیا، فائر کرایا۔ اس کی زد میں آنے والے کچھ مر گئے اور کچھ بھاگ گئے۔ ہائی اسکول کی طرف بھاگنے والوں پر گولے پھینکوائے۔ حوالدار سے کہا: ''اب برباد ہو گئے ہیں۔'' سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا میجر پڑی سے نیچے اتر آئے۔ امان خاں سپاہی سے پانی منگوا کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔ گرم پانی سے سر منہ دھویا۔ کئی دنوں بعد بالوں میں کنگھی کی۔ یہ ان کی زندگی کی آخری صبح تھی۔ وہ غیر شعوری طور پر کسی طویل سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ صوبے دار غلام محمد سے میجر نے کہا۔ ''یار آپ کو پامسٹری میں دسترس ہے۔ ذرا میرا ہاتھ تو دیکھیں۔ غلام محمد نے ہاتھ کا معائنہ کرنے کے بعد کہا: ''جناب! آپ کے ہاتھ کی لکیریں دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی غماز ہیں، ہاتھ کے ابھار نمایاں ہیں۔'' یہ باتیں تو درست ہیں، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، آیا میری قسمت میں شہادت بھی ہے یا نہیں......؟'' صوبے دار غلام محمد نے کہا۔ ''جناب! آپ کی قسمت میں شہادت تو ہے لیکن وقت کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں کہ شہادت عمر کے کس حصے میں نصیب ہوگی۔'' میجر نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: ''صوبے دار صاحب اگر آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکے، تو میں آپ کو بتا دوں، میری شہادت دور نہیں۔''

دشمن کی طرف سے فائر آ رہا تھا لیکن میجر کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میجر نے دشمن کے دو ٹینک تباہ کیے۔

میجر بلندی پر دوربین سے دشمن کی حرکات کا مشاہدہ کر رہے تھے دشمن پر گولہ باری ہو رہی تھی۔ دشمن کی طرف سے ایک گولہ آیا جوان کے قریب شیشم کے درخت کو کاٹتا ہوا اینٹوں کے ڈھیر پر گرا۔ میجر اس جگہ سے بہ مشکل چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ صبح کے نو بجے ہیں۔ ایک لوہے کا ٹھوس گولہ میجر کے سینے کو چیرتا ہوا، دائیں پھیپھڑے سے پار ہوا۔ میجر منہ کے بل گرے۔ فرض شناسی اور شجاعت و بہادری کا پیکر، ایثار کا مجسمہ عسکری تاریخ کا عظیم ہیرو بنا۔ پیارے بچو! 6 ستمبر 1965ء کے اس ہیرو کا نام بتایئے:

اگست کے کھوج لگایئے کا جواب یہ ہے کہ ویٹر جھوٹ بول رہا تھا۔ کیوں کہ ہوٹل کے کمرے میں روشن دان نہیں تھا۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ
2- محمد عثمان، ملتان
3- نور حسین قادری، کاموکی
4- علیہ علی، لاہور
5- وردا زہرہ، جھنگ

صحن میں ایک طرف موجود چولہے سے اٹھتا کڑوا دھواں فضا کو آلودہ کر رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے ساری لکڑیاں گیلی ہو گئی تھیں۔ بی اماں پھونک مار مار کر ہلکان ہو چلی تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھے تین افراد دبے دبے مسکراتے جب کہ بارہ سالہ بھولی آگ جلانے کے لیے ان کی مدد کر رہی تھی۔ اتنے میں چھ سالہ ہمایوں کمرے سے اٹھ کر آیا اور بھولی سے کہا: ''آپی! جلدی کریں۔ میرا ابھی اتنا کام پڑا ہوا ہے۔ اگر آج یہ کام مکمل نہ ہوا تو میں صبح مولا بخش سے متعارف ہو جاؤں گا۔''

بی اماں کو مٹی کا تیل پکڑاتی بھولی نے اسے دلاسہ دیا کہ وہ صرف دس منٹ میں اس کے پاس آتی ہے۔ تب تک وہ اپنا کوئی دوسرا کام دیکھ لے۔

''نہیں! آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ میرا سارا کام ہو گیا ہے۔'' ہمایوں اڑ گیا۔

''ہمایوں! بری بات بیٹا۔ بھولی ابھی کام کر رہی ہے ناں۔ بس تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔'' دادا جی نے اسے سمجھایا۔

''نہیں! دادا ابو! کام بہت ضروری ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ناں ماسٹر بوٹا کو۔ کتنی زور زور سے مارتے ہیں وہ۔ نہیں بھئی نہیں میں مار نہیں کھاؤں گا۔ آپی! پلیز آئیں ناں۔'' اس نے بھولی کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

''اچھا! تم ایسا کرو کہ اپنی کتابیں باہر لے آؤ۔ آج میں تمہیں کام کرواتا ہوں۔'' ان کے کہنے پر وہ دوڑا دوڑا گیا اور اپنی کاپی پنسل اٹھا لایا۔

''اچھا بتاؤ کیا کام کرنا ہے؟'' دادا ابو نے اس سے پوچھا۔

میں نے ایک مضمون لکھنا ہے جس کا عنوان ہے۔ ''یوم دفاع کی اہمیت'' کیوں کہ ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا ہے ناں۔ اس نے ان کو بتایا۔ یہ بات سن کر دادا جی کے چہرے کی چمک ایک لمحے کے لیے بڑھ گئی اور بھولی کے چہرے پر بھی احساسِ تفاخر اپنی بہار دکھلا گیا۔ بی اماں ابھی تک منہ کے الٹے سیدھے زاویے بنا رہی تھیں۔ بھائی احمد اور تانیہ اب اپنے اپنے آئی پیڈز پر گیمز کھیلنے میں مصروف تھے۔ احمد اور تانیہ کے ابو سفیر تھے۔ اس لیے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دوسرے ممالک میں گزرتا تھا۔ احمد اور تانیہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ دادا ابو نے کچھ سوچ کر تمام حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولے۔

''بچو! آج ہم سب مل کر ہمایوں کی مدد کریں گے تاکہ وہ اپنا ہوم ورک اچھے طریقے سے کر لے۔''

''مگر دادا جان! آپ اکیلے بھی تو یہ سب کر سکتے ہیں۔ بھلا ہمیں اس ڈسکشن میں انوالو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے غالباً عنوان سن لیا تھا اسی لیے جان چھڑا رہی تھی۔ وہ معلومات پاکستان کے بارے میں بالکل کوری تھی۔

''بیٹا! میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بس جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' ان کی فوجی طبیعت عود آئی۔

''جی! دادا جی۔'' اور اس نے سر جھکا لیا۔ بھولی اندر سے جا کر موڑھا لے آئی اور اس پر براجمان ہوگئی۔

''دادا جان! سب سے پہلے میں بولوں گی۔'' بھولی نے پُر جوش ہو کر کہا۔

''ہوں...... بولو۔'' دادا جی نے اجازت دی۔

''6 ستمبر'' کو ''یوم دفاع'' کہا جاتا ہے کیوں کہ اس دن کی رات کو ہمارے ازلی دشمن بھارت نے ہماری سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پھر جم کر لڑائی ہوئی اور بھارت بھاگ گیا، اپنی دم دبا کر۔'' بھولی آخر پر ہنس پڑی۔

''مگر بھولی! تم نے تو بتایا ہی نہیں کہ یہ جنگ کب، کیوں اور کہاں ہوئی؟'' دادا جان نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''وہ میں بتاؤں گا دادا جان۔'' احمد نے کہا اور پھر شروع ہو گیا۔ یہ جنگ 6 ستمبر 1965ء کو لڑی گئی جو کہ سترہ روز جاری رہی۔ بھارت پاکستان کو کم تر سمجھتا تھا اس لیے اس پر قبضہ کرنے کے لیے اس نے رات کو واہگہ بارڈر پر دھاوا بول دیا۔ لاہور، سیالکوٹ اور سرگودھا ان کا اہم ہدف تھے اور تینوں ہی مقامات پر اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس جنگ کے دوران قوم کا بچہ بچہ اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ جڑ گیا اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے اور مختلف شعبوں سے وابستہ افراد نے اپنے فرائض بخوبی سر انجام دیئے۔ اس جنگ کے نتیجے میں پاکستان ایک اہم قوت بن گیا تھا اور اسی جنگ میں مختلف ریکارڈز بھی بنے۔ اس سے پہلے کہ احمد کچھ اور بولتا تانیہ یک دم چلا اٹھی۔

''بس! آگے میں بتاؤں گی۔ ایم ایم عالم نے سرگودھا میں دو منٹ میں پورے پانچ بھارتی طیاروں کا صفایا کیا، سیالکوٹ میں دنیا کی ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی اور اس دوران پاکستان کے 165 ٹینک جب کہ بھارت کے 475 ٹینک تباہ ہوئے تھے۔ تانیہ جو کب سے آئی پیڈ پر سر جھکا کر بیٹھی تھی پھر بول اٹھی اور اس کی اس حرکت پر باقی افراد مسکرا کر رہ گئے۔

''یعنی کہ بھارت کے 320 ٹینک زیادہ مارے گئے۔ واہ!'' بھولی نے حساب کتاب کر کے کہا۔ ہمایوں ساتھ ساتھ اہم نکات نوٹ کر رہا تھا۔

''اور دوارکا کی بھارتی بندرگاہ کو 8 ستمبر کی درمیانی شب کو تباہ کر کے ہماری بحریہ نے بھی اس میدان میں جھنڈے گاڑ دیئے۔'' احمد نے کہا۔

بحریہ کا نام سن کر دادا ابو کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ ان کو اپنا جوان بیٹا سفید وردی میں نظر آنے لگا جو اپنے فرائض کو تن دہی سے انجام دیتے ہوئے شہادت کا مزہ چکھ گیا۔ بھولی اور ہمایوں کو ابو بھی اپنی خدمات بری فوج میں ادا کر رہے تھے جب کہ تانیہ اور احمد کے ابو بیرون ملک اپنے ملک کی شان کی نمائندگی کرتے تھے۔ بی اماں آگ سے فارغ ہو کر ان کے درمیان آ بیٹھیں اور اب وہ اپنی کہانی سنا رہی تھیں جسے بچے بڑے شوق سے سن رہے تھے۔

''جب جنگ کا اعلان ہوا تو میں بہت گھبرا گئی تھی۔ تمہارے دادا اپنی ڈیوٹی پر تھے اور میں یہاں اکیلی چار بچوں کے ساتھ مگر پھر آہستہ آہستہ جب گولیوں کی آواز سننے کی عادت ہوگئی تو میں اور گاؤں کی اور بھی کئی عورتیں بھٹ پر دانے بھون کر قریب ہی فوج کے پڑاؤ کی طرف جاتیں اور ان کو کھانے کے لیے دے کر آتیں۔ فوجی بے چارے صبح سے لے کر شام تک بھوک سے بے پرواہ ہو کر دشمن کا سامنا کر رہے ہوتے تھے۔ رات کو جب بوڑھے بزرگ ریڈیو لے کر برگد کے درخت تلے بیٹھتے ہم عورتیں بھی چھت پر کھڑی ہو کر خبریں سنتے تھے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگا کرتے تھے کہ ہماری اس آزادی کو دشمن کی نظر بد نہ لگے۔'' یہ کہہ کر دادی خاموش ہوگئیں اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگیں۔ ماحول بڑا سوگ وار ہو گیا تھا اس لیے بچے وہاں سے اٹھ کر چھت پر کھیلنے چلے گئے۔

''ماجد کہہ رہا تھا کہ وہ آج آئے گا مگر اب شام ہوگئی ہے اور ابھی تک نہیں آیا۔'' بی اماں کے چہرے پر فکر صاف دیکھی جا سکتی تھی اور دادا ابو صحن کے عین بیچ میں کھڑے آم کے درخت کو دیکھ

رہے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" بی اماں نے ان کی سوچوں کو مزید بھٹکنے سے روکا۔

"اوں...... میں سوچ رہا تھا کہ جب ماجد اپنے اس درخت کو دیکھے گا تو کیا کہے گا۔" وہ ابھی تک درخت کو دیکھ رہے تھے۔ نجانے کیوں ماجد کو اس درخت سے بہت پیار تھا اور اب اسے نیچے سے دادا ابو نے کٹروا دیا تھا تا کہ اس کی شاخیں آنے جانے والوں کو تنگ نہ کریں۔

"کچھ نہیں کہے گا وہ۔ اب تو بہت سمجھ دار ہو گیا ہو گا۔" بی اماں نے ان کے خیال کی تردید کی۔

"ہاں! شاید ایسا ہی ہو۔" انہوں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ ماجد ان کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا جو صرف ان کے حکم پر سپاہی بنا۔ ورنہ تو وہ فطرتاً ایک شاعر تھا۔ خوب صورت چیزیں اور مناظر اسے اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتے تھے۔ اسے پھولوں سے لدے پودے، پھلوں سے جھکتی شاخیں، آسمان پر چھائے بادل، کوئل کی سریلی آواز اور اپنے درخت کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ یا تو رنگوں سے ان خوب صورت مناظر کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا یا پھر اپنے درخت کی سب سے اونچی ڈالی پر بیٹھ جاتا۔ سارے لوگ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئے مگر وہ نہ آیا۔ پھر رات کے اڑھائی بجے رات کے اندھیرے میں کوئی سایہ گھر میں داخل ہوا اور سیدھا دادا جی کی چارپائی کی طرف بڑھا۔ وہ ماجد تھا۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں اپنے باپ کا ایک جملہ گونجا۔

"ایک نوجوان کو ایک سپاہی کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

اس نے کتنی تکرار کی تھی اپنے ابو سے کہ وہ فوج میں نہیں جائے گا مگر اسے جانا پڑا اور آج تین مہینے بعد اسے صرف ایک دن کی چھٹی ملی۔ وہ آہستہ سے بول رہا تھا۔

"ابا جان! میں جب اس گھر سے جا رہا تھا تو آپ سے شاکی تھا کہ آپ نے مجھے میری مرضی کے بغیر فوج میں بھیج دیا۔ مگر وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ میرے کندھوں پر کتنی بڑی ذمہ داری ہے اپنے وطن کو محفوظ رکھنے کی اور بے شک آپ اس وقت درست تھے اور میں غلط۔ ابا جان میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنا فرض ضرور نبھاؤں گا جیسے ولید بھائی نے نبھایا اور جیسے حمزہ بھائی نبھا رہے ہیں۔"

اس کے بعد وہ کھڑے ہو گئے اور سوئے ہوئے تمام افراد پر نظر ڈالی وہ ان کو جگانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کے آرام میں کوئی خلل پڑے۔ ان کو نہایت اہم مشن کے لیے چن لیا گیا تھا کیوں کہ انہوں نے ان تین مہینوں میں نہایت شان دار کارکردگی دکھائی تھی۔

"میرا مقبول حسین" دادا ابو کے منہ سے نکلا۔ وہ انہیں سویا ہوا سمجھ رہے تھے جب کہ وہ تو ان کے انتظار میں اب تک جاگ رہے تھے۔ پھر ان کو اپنا وہ ساتھی یاد آیا جو 1965ء کی جنگ میں قیدی بنا تھا اور بے شمار اذیتیں جھیلنے کے بعد 2005ء میں پھر سے اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔

چلتے ہوئے ماجد کی نظر آم کے درخت پر پڑی جو اس کو نہایت سرشاری کے عالم میں تک رہا تھا۔ اس کو اس طرح سے تراشا ہوا دیکھ کر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

ساون کا مہینہ　　　پون کرے شور
میں اُتے کس طرح آواں　　　میری سیڑھی کٹ گئے چور

اور یہ آواز سرسراتی ہوئی کسی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ انہوں نے نہایت فخر سے سوچا کہ وہ سپاہیوں اور شہید کے باپ ہیں اور ان کو یقین تھا کہ جب جب ملک و ملت پر امتحان کی گھڑی آئے گی تب تب نوجوان اپنے جذبہ غیرت کو للکار کر میدان میں اتریں گے اور ستمبر جیسے مہینے اپنی تاریخ میں رقم کریں گے۔ بے شک ابھی کچھ لوگوں کا جذبہ سویا ہوا ہے مگر ہے تو سہی جو وقت آنے پر جاگ اٹھے گا۔ وہ مردہ دلوں سے تو بہتر ہیں۔

میرا وطن　　　میرا ستمبر

انہوں نے سوچا اور پھر اطمینان سے سو گئے۔

☆☆☆

نجف کے موتی

☆ کبھی تلواروں کے وار خالی ہو جاتے ہیں اور خواب سچے ہو جاتے ہیں۔
☆ خاموشی عالم کے لیے زینت اور جاہل کے لیے پردۂ جہالت ہے۔
☆ جب خدا کسی کو ذلیل کرتا ہے، علم اس پر حرام کر دیتا ہے۔
☆ میزان اعمال کو خیرات کے وزن سے بھاری کرو۔
☆ جو کسی کی غیبت سنتا ہے گویا وہ خود غیبت کرتا ہے۔
☆ کارخانۂ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے۔ (خنساء حسینی، کلورکوٹ)

فاختہ...... امن کی علامت ایک دلکش اور دل نواز پرندہ ہے۔ جس کی ایک پہچان ''حق ہو...... حق ہو'' کا اثر آفریں ورد بھی ہے۔ صبح کا سنہرا وقت ہو یا شام کے آرام کرتے لمحے یا رات کی پرسکون ساعتیں، اس دل فریب پرندے یعنی فاختہ کی آواز ہمیشہ کانوں میں رس گھولتی ہے۔

تاریخی حوالے سے روایات میں ملتا ہے کہ جب طوفان تھما اور چالیس دن گزر گئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی میں موجود پرندوں میں سے ایک پرندے کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ کہیں خشکی نظر آ رہی ہے یا نہیں۔ پھر جب وہ پرندہ واپس لوٹا تو اس کی چونچ میں زیتون کی شاخ تھی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ زمین نظر آنے لگی ہے اور رب کی زمین پر اس کا دور شروع ہو چکا ہے۔ کشتی کے سوار سب مسافر خشک زمین پر اتر کر اس نئے دور کا آغاز کر سکتے ہیں۔ پیارے بچو! ڈوبی زمین پر خشکی کی خبر لانے والا یہ پرندہ...... فاختہ تھا۔ تب سے فاختہ امن و سلامتی کی علامت بن گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فاختہ ایک شریف اور بے ضرر پرندہ ہے۔ اقوام عالم کے نمائندہ ادارے اقوام متحدہ کی پہچان بھی زیتون کی شاخ چونچ میں تھامے فاختہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ فاختہ کی معصومیت یعنی بھولپن اس کی مثالی صفت یعنی خاص خوبی تصور کی جاتی ہے۔

فاختہ ایک نرم دل، امن پسند اور ہم درد پرندہ ہے۔ بچپن کی یادیں انسانی زندگی کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔ برسوں پہلے ایک کہانی کی صورت چھوٹی کلاس کی اردو کی کتابوں میں ایک واقعہ پڑھا تھا، جو احسان کا بدلہ احسان کا درس دیتی ایک بہترین کہانی تھی۔ کہانی کچھ یوں تھی:

''ایک دفعہ ایک شکاری جنگل میں شکار کرنے گیا۔ اس نے درخت کی شاخ پہ بیٹھی فاختہ کو دیکھا تو بندوق سے نشانہ باندھنے لگا۔ فاختہ اس بات سے بے خبر تھی۔ اسی دوران ایک چیونٹی نے یہ ماجرا دیکھا تو شکاری کے پاؤں پر کاٹ لیا۔ یوں نشانہ خطا ہو گیا اور فاختہ اڑ گئی۔ چند دن گزرے۔ چیونٹی نہر کنارے پانی پینے گئی تو پانی میں گر گئی۔ فاختہ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً ایک پتا توڑا اور چیونٹی کے آگے لا کر پانی میں ڈال دیا۔ یوں چیونٹی اس پتے پر چڑھ کر کنارے آ گئی اور اس کی جان بچ گئی۔ اس کہانی کے مطابق

فاختہ نے احسان کا بدلہ چکا کر چیونٹی کی جان تو بچا لی مگر پھر اس شکاری سے خود کو نہ بچا پائی جو نہر کے کناروں، جنگلوں اور سبزہ زاروں میں اس کے شکار کے لیے گھومتا رہا اور ہر نظر آنے والی فاختہ کو بندوق کا نشانہ بناتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل فاختاؤں کی ایک نسل معدوم ہو چکی ہے۔

اگر ماضی کی طرف نظر دوڑائیں تو آج سے چالیس پچاس سال پہلے ہمارے گھروں میں کچے کمروں کو ہوا سے معمور کرنے کے لیے روشن دان ہوتے تھے۔ جو جون، جولائی کے مہینوں میں فاختاؤں کے گھونسلوں سے آباد ہو جاتے تھے۔ گھر کے آنگن میں موجود ٹالی، کیکر، آم، بیر، انجیر، نیم و توت کے درختوں پر فاختاؤں کے آشیانے نظر آتے تھے۔ اسی طرح انار، امرود اور مالٹوں کے جھاڑ میں بھی اس معصوم پرندے کے گھونسلوں، بچوں سے شاد و آباد رہتے تھے۔

فاختہ اور کبوتر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اسے کبوتر کا بہت قریبی رشتہ دار بھی کہا جاتا ہے۔ کبوتر اور فاختہ میں تمیز کرنے کا سادہ اصول یہ ہے کہ اس درجے کے چھوٹے اور درمیانی جسامت کے پرندے فاختہ کہلاتے ہیں جبکہ بڑے کبوتر۔ دونوں فاختہ اور کبوتر خوب صورتی میں بے مثال ہیں۔ فاختہ پر پھیلا کر اڑان بھرتی ہے تو نظر بھی اس کی رفتار کی اسیر ہو جاتی ہے۔ جب فاختہ اڑان بھرتی ہے تو اس کے پروں سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ ماحول کو دل کش آہٹ دیتی ہے۔ یہ سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ ایک ہی اڑان میں کر سکتی ہے۔ فاختہ کی خاصیت ہے کہ یہ مسلسل میلوں کا سفر طے کرنے کے باوجود نہیں تھکتی۔

فاختہ اگرچہ ایک پالتو پرندہ نہیں ہے۔ تاہم اسے گھروں میں پالا جاتا ہے۔ چڑیا گھروں میں اس کے جوڑے بڑے بڑے پنجروں میں قید رکھے جاتے ہیں۔ روٹی کے ٹکڑے، باجرہ اور کنگنی اس کی پسندیدہ غذا ہے۔ فاختہ عموماً تفریح یا منافع حاصل کرنے کے لیے پالی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انسان پچھلے کئی سو برسوں سے اسے پال رہا ہے۔ پاکستان میں کبوتر کو پالنے والے تو عام مل جاتے ہیں مگر فاختہ کے معاملے میں یہ رویہ شاذ ہی نظر آتا ہے۔ تاہم کئی ممالک میں اسے خصوصی طور پر پالا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا گوشت نہایت لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔

فاختہ پالنے کے حوالے سے ضروری ہے کہ ان پرندوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے تو یہ لمبے عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔ اسے پالنے میں آسانی یہ ہے کہ اسے چھوٹے ڈربے میں بھی رکھا جا سکتا ہے جبکہ کبوتر کے لیے بڑا ڈربہ درکار ہوتا ہے۔ عموماً ڈربے کی اونچائی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اس کی لمبائی اور چوڑائی۔ اگر ڈربے میں چند جڑی بوٹیاں اگا دی جائیں تو اس کی فطری دل کشی بڑھ جاتی ہے۔ پاکستان میں پائی جانے والی فاختہ پاپ کارن، باجرہ اور کچھ بیج کھا کر بھی بآسانی پل جاتی ہے۔ اس پرندے کی زیادہ اقسام دو انڈے دیتی ہیں اور پھر بارہ سے اٹھارہ دن تک انہیں سیتی ہیں۔

فاختہ ایک حساس پرندہ ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گھونسلوں میں موجود انڈوں کو کوئی ہاتھ لگا دے یا اٹھا کر دوبارہ گھونسلے میں رکھ دو تو فاختہ ان انڈوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی بلکہ یا تو انہیں زمین پر گرا دیے گی یا پھر گھونسلا چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ یہی معاملہ وہ بچوں کے ساتھ بھی کرتی ہے۔ اگر آپ فاختہ کے بے پر بچوں کو ہاتھ لگا دیں یا ایک بار اٹھا کر واپس رکھ دیں تو وہ ان بچوں کو گھونسلوں سے گرا دے گی۔ یہ بچے نیچے موجود جانوروں مثلاً بلیوں وغیرہ کی خوراک بن جاتے ہیں۔ گویا فاختہ اس معاملے میں اتنی حساس ہے کہ اپنی گھریلو زندگی میں مداخلت اسے سخت ناپسند ہے۔ جس کے لیے وہ اپنے بچوں تک کو نیچے پھینک دیتی ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ چوں کہ فاختہ اور کبوتر خود ہی اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اس لیے دوسرے پرندوں کی نسبت انہیں پالنا آسان ہے۔ کبوتروں کے برعکس فاختاؤں کے بچے زیادہ عرصہ گھونسلے میں گزارتے ہیں یعنی جب ان کے اچھی طرح پر نکل آئیں تبھی یہ گھونسلے سے باہر آتے ہیں۔ سانپ اور کچھ بڑے پرندے عقاب، گدھ، الو اور چیل وغیرہ فاختہ کے دشمن ہیں۔ فاختہ کی عمر زیادہ سے زیادہ دو سال ہوتی ہے۔

پاکستان میں پائی جانے والی فاختہ کا رنگ خاکی اور بھورے کی آمیزش لیے ہوتا ہے۔ یہ رنگ گرمیوں میں ہلکا اور سردیوں میں تیز ہو جاتا ہے۔ سفید فاختائیں بھی یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جو اس علاقے کا حسن بڑھاتی ہیں۔ نیوزی لینڈ میں فاختہ کی ایک منفرد قسم پائی جاتی ہے اسے چیتوں والی فاختہ کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں فاختہ کی ایک مشہور قسم ''نیل کنٹھ فاختہ'' پائی جاتی تھی۔ تقریباً

ایک صدی پہلے تک کنٹھ فاختہ صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود تھی۔ پھر کچھ مخصوص حالات کے تحت یہ پرندہ مشرقی یورپ کی طرف ہجرت کر گیا۔ وہاں سے یہ مغرب چلا گیا۔1950ء تک یہ فاختہ برطانیہ پہنچ گئی۔ آج یہ آئس لینڈ اور ناروے جیسے سرد ممالک میں بھی پائی جاتی ہے۔ کنٹھ فاختہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر اس جگہ کو اپنا مسکن بنا لیتی ہے، جہاں درخت موجود ہوں۔

فاختہ بھرے جسم، لمبی چونچ اور چھوٹی گردن والا ایک خوب صورت پرندہ ہے۔ یہ درختوں میں بسیرا کرتا اور اپنا گھونسلا بناتا ہے۔ مادہ موسم کے مطابق دو سفید انڈے دیتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں ان انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ عموماً یہ پرندہ بیج، پھل، کیڑے مکوڑے اور پودوں کے نرم حصے کھاتا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گول ہوتی ہیں۔ کالے پنجے، کالی چونچ اور سفید سینے کے ساتھ جب یہ اڑان بھرتی ہے تو اس کا پھیلاؤ سترہ اعشاریہ سات انچ تک چلا جاتا ہے۔ نر فاختہ کا وزن عموماً سو گرام تک ہوتا ہے۔ البتہ مادہ کا وزن نسبتاً کم ہوتا ہے۔

فاختہ کو گھونسلے کی تیاری میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ عام طور پر انگریزی حرف V کی شکل رکھنے والی پتلی سی مضبوط شاخ پر اوپر تلے چند تنکے گول پیالے کی صورت رکھ دیئے جاتے ہیں۔ یوں گھونسلا تیار ہو جاتا ہے۔ ان گھونسلوں میں فاختہ ایک سال میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ مرتبہ دو، دو انڈے دیتی ہے۔ جن کو نر اور مادہ مل کر سیتے ہیں۔ دو ہفتوں میں ان انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔

فاختہ اور کبوتر کی یہ خاصیت ہے کہ یہ اپنے پوٹے میں ایک خاص قسم کا دودھ جیسے پوٹا دودھ (Crop Milk) کہا جاتا ہے، پیدا کرتے ہیں۔ یہ ان کے بچوں کی نشوونما کے لیے بھرپور غذا کا کام کرتا ہے۔ فاختہ کی اقسام ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ تاہم زیادہ اقسام برصغیر پاک و ہند، جنوب مشرقی ایشیا اور آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں۔

فاختہ جنگلوں، درختوں اور نہروں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں، میدانوں اور مختلف سبزہ زاروں میں بھی بسیرا کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ صحراؤں میں بھی ملتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ بارشوں کا کھڑا اور رکا پانی بھی پی لیتی ہے۔ البتہ دوران پرواز عقاب اور اس طرح کے بڑے پرندے اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ شکاری جانوروں مثلاً بلیوں، لومڑیوں وغیرہ کی بھی خوراک بن جاتی ہے۔

☆☆☆

سچے پاکستانی بنو!

بچو! سن لو ایک نصیحت
اپنے وطن سے کرو محبت
اس کا روشن نام کرو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!
تم ہی ہو مستقبل اس کا
اقبالؒ نے دیکھا خواب تھا جس کا
خواب میں اس کے رنگ بھرو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!
کام، کام اور بس کام
ہر پل، ہر دن اور ہر شام
قائدؒ کے فرماں پہ چلو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!
ہر مشکل حالات سے لڑ کے
پرچم اس کا اونچا کر کے
ہر میدان میں آگے بڑھو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!
اللہ، نبیؐ اور قرآن
ان سے ہے ہم سب کی شان
ہر دم نعرۂ حق کہو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!
قرض اٹھا کے جینا نہیں
سر کو جھکا کے جینا نہیں
عزت سے تم جیو، مرو
اچھے پاکستانی بنو!
سچے پاکستانی بنو!

☆☆☆ (شاہد حسین، لاہور)

قیام

رائے صاحب پریشان تھے کیوں کہ عزیق اور نایاب واپس نہیں لوٹے تھے۔ پہلے پہل وہ یہ سمجھے کہ شاید دونوں بہن بھائی سیر پر نہ نکل گئے ہوں، یا ہوسکتا ہے کہ عزیق کو کوئی غیر معمولی پرندہ مل گیا ہو اور وہ وقت کے بارے میں بالکل بھول گیا ہو لیکن پھر جب گھنٹے بیت گئے اور ابھی بھی بچے واپس نہیں لوٹے تو وہ واقعی بہت پریشان ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹیلی فون کرنے میں چچی نے لمبی مدت لگا دی۔

یہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ معاذ کے ساتھ بھی جا سکتے ہیں، اگر یہ ان کے ذہن میں ہوتا تو وہ فوراً معاذ کے چچا کو ٹیلی فون کر سکتے تھے۔ جب معاذ کی چچی نے انہیں فون کر کے یہ اطلاع دی کہ بچے محفوظ ہیں تو رائے صاحب کی جان میں جان آئی۔ وہ بتا رہی تھیں کہ وہ معاذ کے ساتھ ہی میرے پاس آ گئے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں کہ انہیں ایسا کرنے کی اجازت کیسے مل گئی لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں انہیں مزید اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔

یہ بات سن کر رائے صاحب کا دل جیسے ڈوب ہی گیا کیوں کہ ایک لمحہ ایسا تھا جب انہیں محسوس ہوا کہ شاید ان کی جان عزیق، نایاب اور ان کے بدتمیز توتے سے چھوٹ گئی ہے لیکن اب ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ رائے صاحب نے بڑے ادب سے چچی کو کہا۔ ''ٹھیک ہے بیگم آصف! مجھے اس بارے میں افسوس ہے، بچے مجھے بتا کر گئے تھے کہ وہ معاذ کو الوداع کہنے جا رہے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ معاذ نے انہیں ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ باقی چھٹیاں بچوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچے چھٹیاں آپ اور معاذ کے ساتھ گزارنا پسند کریں گے۔ وہ صحیح کہہ رہے ہیں کہ ان کے تایا چوہدری انہیں ابھی واپس بلانا نہیں چاہتے۔ البتہ انہوں نے مجھے بچوں کے مزید اخراجات کے لیے کافی رقم بھی بھیجی ہے تاکہ میں انہیں ساری چھٹیاں ساتھ رکھ سکوں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر وہ رقم میں آپ کو بھجوا دوں لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے اگر آپ مزید کچھ دیر بچے اپنے ساتھ رکھیں اور اس سلسلہ میں بچوں کے تایا جان سے بھی بات کر لیتا ہوں۔'' یہ باتیں سن کر ٹیلی فون پر تھوڑی سی خاموشی ہو گئی اور پھر چچی جان نے پوچھا۔ ''کتنی رقم ہے؟''

اب پھر چند لمحے خاموش رہی اور پھر رائے صاحب نے حاصل کردہ رقم بتائی جو واقعی خاصی بڑی رقم تھی۔ چچی جان نے جلدی جلدی سوچا کہ بچوں کے رہنے پر تو کوئی اتنے زیادہ اخراجات نہیں اُٹھیں گے، اس کے علاوہ وہ احتیاط کریں گی کہ بچے آصف صاحب کے کاموں میں مخل نہ ہوں۔ نایاب گھر کے کاموں میں تزئین کی مدد بھی کرے گی اور وہ اپنی تمام ادائیگیاں آرام سے

کر لیں گی جس سے ان کی مصیبت حل ہو گی۔ ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر رائے صاحب چچی کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے، وہ ہر قیمت پر چاہتے تھے کہ کیکی واپس نہ آئے۔ عنریق کو وہ برداشت کر سکتے تھے، نایاب بھی ٹھیک تھی لیکن کیکی کو برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر چچی ایسے بولیں جیسے انہوں نے ہار مان لی ہو۔ انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے سوچنے دیں۔ یہ بہت مشکل ہو گا کیوں کہ ہمارے پاس بہت مختصر سی رہنے والی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے اگرچہ ایک کمرہ تو بہت بڑا ہے مگر مینار والا کمرہ......'' معاذ اور دوسرے بچے وہ تمام باتیں سن چکے تھے جو چچی کے منہ سے نکلیں۔ اب وہ ایک دوسرے کو خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ معاذ نے سرگوشی کی۔ ''چچی ہار مان گئی ہیں، عنریق شرط لگالو تم اور میں مینار والے کمرے میں رہنے والے ہیں۔ میں ہمیشہ سے وہاں سونا چاہتا تھا لیکن چچی نے مجھے کبھی وہاں رہنے نہیں دیا۔''

رائے صاحب ایک دفعہ پھر لجاجت سے بولے۔ ''بیگم آصف! آپ مجھ پر بہت بڑا احسان کریں گی اگر آپ بچوں کی بھاگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لیں گی۔ میں ابھی چوہدری صاحب کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیں اور میں آپ کو فوراً رقم بھی بھجواتا ہوں اور اگر آپ کو مزید رقم کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے گا۔ آپ سوچ نہیں سکتیں آپ مجھ پر کتنی مہربانی کریں گی۔ بہت اچھے بچے ہیں، آپ انہیں آسانی سے سنبھال لیں گی۔

نایاب بہت اچھی بچی ہے، مسئلہ صرف اس بدتمیز توتے کا ہے۔ ہو سکے تو اس کے لیے ایک پنجرہ منگوا لیجئے گا۔'' چچی یہ سن کر تنگ آ کر بولیں۔ ''مجھے اس توتے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' یہ فقرہ سن کر رائے صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیکی نے خوشی سے چیخ ماری جو رائے صاحب نے ٹیلی فون پر صاف سنی۔ رائے صاحب نے سوچا کہ بیگم آصف کمال بہادر عورت ہیں جنہیں کیکی جیسے عفریت سے کوئی مسئلہ نہیں۔ گفتگو یہاں ختم ہو گئی۔ بیگم آصف نے کہا کہ وہ خود چوہدری صاحب کو لکھیں گی جب ان کا ذکر انہوں نے رائے صاحب سے سنا۔ اس اثناء میں وہ وعدہ کر چکی تھیں کہ وہ بقایا تمام چھٹیوں میں بچوں کی دیکھ بھال کریں گی۔ ٹیلی فون کے چونگے رکھ دیئے گئے، بچوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ معاذ اپنی چچی کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ ''چچی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ہمارے دوستوں کو ہمارے ساتھ رہنے دیا، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ چچا کے کام میں دخل نہیں دیں گے اور آپ کے کاموں میں مدد کریں گے۔'' کیکی بھی بڑی شفقت سے بولا۔ ''پیاری چچی!'' اور یہ کہہ کر وہ عنریق کے شانے سے پھدک کر چچی کے شانے پر جا بیٹھا۔ سب حیران پریشان کھڑے تھے، چالاک کیکی چچی کو خوب بنا رہا تھا۔ چچی بولیں۔ ''بے وقوف پرندہ!'' وہ چھپا رہی تھیں کہ دراصل کیکی کی اس حرکت سے وہ کتنی خوش ہوئی ہیں۔ کیکی سب کی امیدوں کے بالکل برعکس بولا۔ ''اللہ سب کا بھلا کرے!'' اور سب کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ چچی بولیں۔ ''معاذ تم اور عنریق مینار والے کمرے میں رہو گے۔ آؤ دیکھتے ہیں وہاں کون کون سی کمی پوری کرنی ہے۔ تزئین تم اپنے کمرے میں دیکھو کہ نایاب تمہارے ساتھ رہے گی تو تمہیں مزید کن چیزوں کی ضرورت ہو گی یا وہ معاذ کے پرانے کمرے میں رہ سکتی ہے۔ دونوں کمرے درمیان سے کھلتے بھی ہیں، اس لیے بہتر ہو گا کہ تم دونوں کمرے استعمال کر لو۔'' تزئین خوشی خوشی نایاب کو لے کر کمرہ دیکھنے گئی۔

نایاب کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح بھائی کے نزدیک ہی سوتی۔ اب جہاں جس کمرے میں سونا تھا مینار والا کمرہ اس سے خاصی مسافت پر تھا۔ عنریق نے بازو پر کیکی کو بٹھایا اور اونچائی پر بنی کھڑکی میں آرام سے بیٹھ کر سمندری پرندوں کو اُڑتا ہوا دیکھنے لگا۔ معاذ چچی کے ہمراہ مینار والے کمرے میں گیا، وہ بہت خوش تھا۔ وہ عنریق اور نایاب کو بہت پسند کرنے لگا تھا اور اسے اپنا خواب حقیقت میں بدلتا دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کئی ہفتے اکٹھے رہنے والے تھے۔ وہ دونوں ایک پتھریلے ڈھلوانی راستے پر گئے۔ پھر وہ ایک تنگ پتھریلے سیڑھیوں والے راستے کے قریب پہنچے اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیڑھیاں چکر کھاتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھیں اور آخر کار وہ مینار والے کمرے میں پہنچ گئیں۔ یہ بالکل بناوٹ میں گول تھا جس کی دیواریں بڑی دبیز تھیں۔ اس میں تین تنگ سی کھڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کا رُخ سمندر کی طرف تھا جس میں بالکل کوئی شیشہ لگا ہوا نہیں تھا۔ کمرہ بہت خستہ تھا اور پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا اور تند لہروں کا شور علیحدہ تھا۔ چچی بولیں۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تم دونوں کو یہاں سردی لگے گی۔'' یہ سن کر معاذ نے فوراً سر نفی میں ہلایا، وہ کہنے لگا۔ ''ہمیں اس کی فکر نہیں ہے، اگر شیشہ کھڑکیوں میں لگا بھی ہوتا تو پھر بھی ہم انہیں کھول کر ہی سوتے، ہم ٹھیک رہیں گے اور بہت خوش بھی۔ وہ دیکھیں شاہ بلوط کی لکڑی سے بنی ایک الماری بھی ہے جس میں ہم اپنی چیزیں رکھ سکتے اور ایک لکڑی کا اسٹول بھی ہے، ہمیں سونے کے لیے

صرف گدا چاہیے ہوگا۔'' چچی بولیں۔ ''ہم ایک چھوٹا پلنگ ان تنگ راستوں سے اوپر لا سکتے ہیں جس کے اوپر گدا بچھا کر تم سو سکتے ہو۔ میرے پاس بڑا گدا ہے جو تم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ میں تزئین کو جھاڑو دے کر اوپر بھیج دوں گی، وہ کمرہ صاف کر دے گی۔'' معاذ بولا۔ ''چچی، دوبارہ آپ کا بہت شکریہ۔

آپ کو ہمارے لیے اتنا کچھ کرنا پڑ رہا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ عتریق اور نایاب کے یہاں رہنے سے آپ کے اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہوگا۔'' چچی نے الماری کا دروازہ بند کیا اور معاذ سے کہنے لگیں۔ ''بیٹے! تم یہ مت سمجھو کہ میں جان بوجھ کر تمہیں اپنی مجبوریاں بتا رہی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہاری والدہ بیمار ہیں اور وہ اب اتنی رقم ماہانہ نہیں بھیج رہیں جتنی وہ پہلے بھیجا کرتی تھیں اور تم جانتے ہو کہ تمہاری اسکول کی فیس خاصی زیادہ ہے اور کئی دفعہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کروں۔ تم اب اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے چچا گھر کی ذمہ داریوں میں اتنی توجہ نہیں دیتے اور میرے پاس جو پیسے ہوتے ہیں وہ پلک جھپکتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔'' معاذ کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ اس کی امی بیمار تھیں اور چچی کو ان سے پیسے نہیں مل رہے تھے۔ یہ سب معاذ کو فکر مند کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''چچی! امی جان کو کیا ہوا ہے؟'' چچی نے جواب دیا۔ ''وہ بہت کمزور ہو چکی ہیں اور انہیں بڑی شدید کھانسی ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ انہیں آرام کی ضرورت ہے اور ہو سکے تو سمندر کے کنارے آرام کریں لیکن وہ نوکری کیسے چھوڑ سکتی ہیں؟'' معاذ کہنے لگا۔ ''چچی میں اسکول چھوڑ دیتا ہوں، میں کسی نہ کسی طور پر کوئی نوکری ڈھونڈ لیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ امی جان ہمارے لیے کام کرتے کرتے مستقل مریضہ بن جائیں۔'' چچی کہنے لگیں۔ ''تم اس طرح نہیں کر سکتے، تم تو ابھی صرف بارہ تیرہ سال کے ہو۔ اب جو پیسے رائے صاحب بھجوا رہے ہیں، اس سے میری مشکلوں میں کچھ کمی ہو گی۔'' معاذ نے گفتگو جاری رکھی، وہ کہنے لگا۔ ''چچی! یہ مکان بہت بڑا ہے، ہم نے یہاں رہ کر کیا کرنا ہے؟ کیوں نہ ہم یہ مکان چھوڑ کر کسی چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہیں جہاں آپ کو بھی اتنی محنت سے کام نہ کرنا پڑے اور جہاں تنہائی کا احساس بھی کم ہو۔ چچی بولیں۔ ''میں اسے بیچنا چاہتی ہوں لیکن آدھا تباہ ہوا مکان کون خریدے گا جہاں ہر وقت تند و تیز ہواؤں کا شور ہو اور وہ عام لوگوں کی دسترس سے اتنی دُور واقع ہو اور میں تمہارے چچا کا کیا کروں؟

وہ اس جگہ سے محبت کرتے ہیں، وہ اس ساحل سے محبت کرتے ہیں اور اس جگہ کو دُنیا بھر میں سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سبھی خواہش پوری نہیں ہوتیں۔ ہمیں یہیں زندگی گزارنا ہے، جب تک تم اور تزئین اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جاؤ۔ معاذ نے سوچا کہ وہ ایک گھر بنائے گا جس میں وہ اپنی ماں اور تزئین کے ساتھ رہے گا۔ پھر وہ اپنی چچی کے ساتھ گدے لانے کے لیے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اس نے عتریق کو آواز دی اور پھر دونوں لڑکے ہانپتے کانپتے تنگ سیڑھیوں کے راستے سے گدے مینار والے کمرے میں لے ہی گئے۔ کیکی اپنی چیخوں اور جملوں سے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ صغیر اس کی باتوں سے البتہ چڑتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا شاید کیکی اسے حکم دے رہا ہے اور کیکی کو علم ہو گیا کہ وہ اس کی باتوں سے چڑتا ہے، تو وہ جان بوجھ کر آوازیں نکال کر اسے چڑاتا رہا۔

صغیر نے ایک چھوٹا میز اور عتریق کا اٹیچی اُٹھایا ہوا تھا جو اس نے مینار والے کمرے میں رکھ دیئے۔ وہ مزاج کا بہت بُرا تھا۔ معاذ سوچ رہا تھا کہ صغیر کا مزاج ہمیشہ سے خراب ہی رہا ہے لیکن اب اس کا دماغ زیادہ ہی خراب لگ رہا تھا۔ معاذ نے اسے پوچھا۔ ''صغیر! کیا مسئلہ ہے؟ کیا آج کل بھی ''چیزیں'' رات کو آوارہ گردی کرتی ہیں؟'' پھر دونوں لڑکے بے اختیار صغیر کے اس مفروضے پر ہنس دیئے کہ شام کو ساحل سمندر پر ''چیزیں'' گھومتی ہیں۔ صغیر بولا۔ ''میں نے تمہاری چچی کو بتایا تھا کہ انہیں یہ کمرہ استعمال میں نہیں لینا چاہیے، یہ بہت بُرا کمرہ ہے اور جب دھند چھٹتی ہے تو یہاں سے دکھ والا جزیرہ نظر آتا ہے اور یہ بہت بڑی بدشگونی ہے، اگر آپ کو دکھوں کا جزیرہ نظر آئے۔'' معاذ نے اسے ہنستے ہوئے کہا۔ ''صغیر! بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' یہی فقرہ فوراً کیکی نے بھی دہرا دیا۔ صغیر، معاذ اور کیکی دونوں پر برسنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''میری بات کا یقین کرو معاذ اور کوشش کرنا کہ علیحدہ کمرے سے ''دکھ کا جزیرہ'' تم نہ ہی دیکھو، لیکن یہی وہ کمرہ ہے جو تم یہاں سے دیکھ سکتے ہو۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ مینار والا کمرہ بُرا کمرہ ہے۔ کبھی کوئی اچھی خبر ''سکھ کے جزیرہ'' سے نہیں آئی۔ مافوق الفطرت لوگ وہاں رہتے ہیں جو بڑے ہیں اور انہوں نے وہاں بڑے کام کیے ہوئے ہیں اور ہمیشہ وہاں سے کوئی نہ کوئی مصیبت ہی نازل ہوتی ہے۔'' پھر اس ڈراؤنی گفتگو کے بعد صغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جاتے وقت اس نے دونوں لڑکوں کو خوب گھورا۔ معاذ طنزاً کہنے لگا۔ ''کیا خوش اخلاق انسان ہے، پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ صغیر یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاتا حالاں کہ کہیں اور وہ یہاں

سے دوگنی رقم کما سکتا ہے۔'' اور پھر دونوں گدے بچھانے لگے۔عزریق کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے معاذ سے پوچھنے لگا۔''یہ دکھ کا جزیرہ کیا ہے اور کیا ڈراؤنا نام ہے لیکن میں تو کوئی جزیرہ دیکھ سکتا ہوں۔'' معاذ نے اسے بتایا۔''تم شاید ہی کبھی اسے دیکھ سکتے ہو، وہ ادھر مغرب میں ہے اور اس کے اردگرد بہت نوکیلی چٹانیں ہیں جہاں پانی کی پھوار ایک چادر بنائے رکھتی ہے، اسی لیے وہاں ہر وقت دھند چھائے رہتی ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا، کبھی وہاں لوگ البتہ رہا کرتے تھے۔''عزریق کہنے لگا۔

''میں وہاں جانا چاہوں گا، وہاں جزیرے میں ہزاروں سمندری پرندے ہوں گے جو ہم سے نہیں ڈریں گے۔ میرے لیے انہیں قریب سے دیکھنا بہت شاندار تجربہ ہوگا۔'' معاذ حیرانی سے عزریق سے پوچھنے لگا۔ ''تم کہتے ہو کہ پرندے ہم سے نہیں ڈریں گے وہ تو کسی سے بھی ڈر جائیں گے۔'' عزریق نے کہا۔ ''لیکن دکھ کے جزیرہ ستون میں پرندوں نے کبھی انسان نہیں دیکھے ہوں گے، اس لیے وہ نہ احتیاط کریں گے اور نہ ہی ڈریں گے۔ میں ان کی بہت ہی قریب سے تصویریں لے سکوں گا۔ میرا دل کرتا ہے کہ ابھی وہاں چلا جاؤں۔'' معاذ کہنے لگا۔ ''لیکن تم جا نہیں سکتے، میں بھی کبھی وہاں نہیں گیا اور شاید کبھی کوئی بھی اتنی دُور تک نہیں گیا، ہم اس کے زیادہ نزدیک جائیں گے تو پھوار ہمیں مکمل گیلا کر دے گی اور پھر وہاں اکثر بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔'' عزریق نے اسے کہا۔ ''گدے جہاں مرضی رکھ دو۔'' وہ دھندوں میں لپٹے جزیرے اور نامانوس پرندوں کے خواب میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے اسے وہاں ایسے پرندے دیکھنے کو ملیں جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ ان کے گھونسلوں اور انڈوں تک پہنچ سکے۔ وہ دُنیا کو یہ عجیب وغریب پرندے اپنی شاندار تصویروں سے دکھا سکے۔ عزریق نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ جزیرے تک جائے گا، بے شک صغیرا اسے جتنا بھی ڈرا لے۔ آخر معاذ اونچی آواز میں بولا۔ ''اب آؤ بھی نیچے سب کے پاس چلیں۔''

بے شک صغیرا اسے جتنا بھی ڈرا لے، وہ اکیلا ہی کپڑے الماری میں رکھ رہا تھا۔ پھر وہ تنگ سیڑھیوں سے نیچے پہنچے۔ اگلے ہفتوں کے بارے میں سوچنا سب کو بہت اچھا لگ رہا تھا جن میں کوئی کام نہ ہو، کوئی سبق نہ ہو۔ صرف سمندر میں نہانا ہو، چٹانوں پر چڑھنا ہو، کشتی میں سیر ہو، سو پتا تھا کہ اچھے دن آ رہے ہیں۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

امان اللہ عزیز، میانوالی۔ نفیسہ فاطمہ قادری، کاموکی۔ انیقہ عزیز، میانوالی۔ ردا اقبال کھوٹ، راول پنڈی۔ رامین نصرت، بہاول پور۔ محمد انس خان، راول پنڈی۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ رافعہ عمران، لاہور۔ عبدالرحمٰن طارق محمود، گوجرانوالہ۔ مشعال آصف، لاہور۔ طیبہ ملک ذوالفقار علی، گوجرانوالہ۔ یمنٰی تنویر، کلورکوٹ۔ آیت گل، حاجی پور۔ مریم ملک ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ حفصہ فرقان، لاہور۔ محمد علی اشرف آرائیں، کبیر والا۔ ثمین مقصود، لاہور۔ محمد عاصم شہزاد، میانوالی۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ عدینہ آئمہ ہاشمی، ببول۔ حفصہ شفیق، میانوالی۔ وجیہہ شہباز، وہاڑی۔ نافع احسان محسی، ملتان۔ مناہل شاہد، سرگودھا۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ مریم بنت علی، کراچی۔ سلمان علی خان، نوشہرہ۔ لائبہ کنول، پشاور۔ صدف آسیہ، کراچی۔ حرا ارشد، سارا ارشد، سرگودھا۔ فاطمۃ الزہرا، لاہور۔ شاہ میر لودھی، فیصل آباد۔ فرحان ظفر، سرگودھا۔ محمد شبیر عباس، لاہور۔ حمنہ شاہد، اسلام آباد۔ ہادیہ خالق، ڈیرہ غازی خان۔ مسفرہ علی، خوشاب۔ محمد عزیر رمضان، ٹیکسلا کینٹ۔ عیینہ، واہ کینٹ۔ خدیجہ عزیر، لاہور۔ مقدس خان، حیدرآباد۔ علی ریاض، بہاول پور۔ آیت شاہد، لاہور۔ بتول طارق، اسلام آباد۔ علینا اختر، کراچی۔ خواجہ اویس احمد، آزاد کشمیر۔ مریم مصطفیٰ، رحیم یار خان۔ عروبہ عاصم، لاہور۔ محمد احمد، ڈیرہ غازی خان۔ مریم شبیر، لاہور۔ وجیہہ خلیل، گوجرانوالہ۔ فاطمہ احمد، راول پنڈی۔ ماہین صباحت، لاہور۔ صفی اللہ عابد، جڑانوالہ۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ ہانیہ آصف، لاہور۔ ناعمہ تحریم، کراچی۔ طلحہ خباب علی، تلہ گنگ۔ کائنات فاروقی، راول پنڈی۔ نادیہ رفیق، وجھیانوالہ۔ جویریہ آصف، لاہور۔ محمد عثمان منیر، چونیاں۔ مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ طلحہ قطب، لاہور۔ تطہیر زہرہ، اسلام آباد۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ ہارون یوسف، لاہور۔ فاطمہ زہرا، راول پنڈی۔ منیب الرحمٰن، میانوالی۔ یسریٰ فاطمہ، بہاول پور۔ حماد ظفر اقبال، گوجرانوالہ۔ سارہ جاوید، لاہور۔ حفصہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ مقصود اختر، لاہور۔ محمد ولد عابد حسین، اسلام آباد۔ مہک ناصر، فیصل آباد۔ محمد الیاس بھٹی، وہوا۔ صفا تصور، آزاد کشمیر۔ انوشہ فاطمہ، لاہور۔ محمد دانیال شاہین، بھکر۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ مریم عثمان، راول پنڈی۔ ماریہ اعظم، قلعہ دیدار سنگھ۔ اقصیٰ خالد، اسلام آباد۔ مصباح صدف مبشر، جھنگ۔ عروبہ امین، کراچی۔ قنبر علی، لاہور۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ محمد منیر ستار، محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ منزہ بتول، گجرات۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ روشن نظر، لاہور۔ محمد یحییٰ خان، فیصل آباد۔ سمیع اللہ، واہ کینٹ۔ عزیرائے زید، کمالیہ۔ مریم عثمان، راول پنڈی۔ اقراء شمس، ڈیرہ اسماعیل خان۔ نور الایمان، فیصل آباد۔ حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔

خوب صورت باغیچہ

مہرین بٹ، لاہور

سارہ کو پھول اور پودے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنے باغیچے کو ہمیشہ سجا کر رکھتی تھی اور ہمیشہ اپنے باغیچے کے لیے نرسری سے پودے خرید کر لاتی تھی اور بلاشبہ اس کا باغیچہ محلے میں سب سے زیادہ پیارا اور خوب صورت تھا۔ جتنا چھوٹا تھا، اتنا ہی پیارا، ہرا بھرا اور خوب صورت۔ سب کی خواہش تھی کہ اس کا باغ سارہ جیسا ہو۔

سارہ بہت اچھی اور لائق بچی تھی پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی اور وہ اپنے باغیچے کی دیکھ بھال خود ہی کرتی تھی۔ اس کے پانچویں کلاس کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ اس کی امی نے کہا کہ باغیچے کے لیے مالی رکھ لیں تاکہ سارہ پیپرز کی تیاری پوری توجہ سے کر سکے۔ پہلے تو سارہ نے انکار کر دیا مگر پھر اس نے سوچا کہ پڑھائی بھی تو ضروری ہے اور مالی کا تو کام ہی یہی ہے، اس لیے سارہ کے باغیچے کے لیے مالی رکھ لیا گیا۔ اب سارہ زیادہ وقت پڑھتی تھی اور فارغ وقت میں اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلتی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ گھنٹی بجی تو امی نے کہا کہ سارہ دیکھو تو مالی آیا ہو گا۔ سارہ اس وقت فارغ تھی۔ ”امی جان، میں دیکھوں! مالی باغیچے کی کیسی دیکھ بھال کرتا ہے؟“ سارہ نے پوچھا تو امی نے کہا ٹھیک ہے۔ سارہ جب باہر آئی تو مالی ڈھیر سارا پانی ایک گملے میں ڈال رہا تھا، دوسرے میں اس سے آدھا اور تیسرے میں سب سے کم۔ سارہ کو یہ دیکھ کر بہت بُرا لگا اور افسوس ہوا کہ مالی پودوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے۔ ”مالی بابا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ سارہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا بیٹا جی؟“ مالی نے پوچھا۔

مالی بابا آپ نے ایک گملے میں اتنا زیادہ پانی ڈال دیا اور دوسرے میں اتنا کم!“ سارہ غصے سے بولی۔ ”بیٹا! میں نے تو دھیان ہی نہیں دیا اس طرف۔“ مالی نے وضاحت پیش کی۔

”دیکھیں مالی بابا اگر ایک انسان پوری روٹی کھا لے اور دوسری آدھی تو دوسرے انسان کا کیا ہوگا؟ اس کا پیٹ نہیں بھرے گا ایسے ہی اس گملے کو بھی اور پانی چاہیے تھا۔ اگر میں بھی ایسے ہی کرتی تو میرا باغیچہ خوب صورت نہیں ہوتا بلکہ سڑا ہوا ہوتا اور پھر کیوں لوگ میرے باغیچے کی اتنی تعریفیں کرتے مالی بابا؟“ سارہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

”سوری بیٹا، آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔“ مالی نے کہا۔ سو پیارے بچو! ہمیں بھی اپنے پودوں کا خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ پودے ہمیں آلودگی سے بچاتے ہیں، سانس لینے میں مدد کرتے ہیں اور ماحول کو خوش گوار بناتے ہیں۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

نئی سوچ

سیمل سکینہ، مظفر گڑھ

”شیراز...... شیراز...... پانی کا ایک گلاس لاؤ۔“ صائم نے اپنے نوکر کو آواز دی جس کی عمر دس بارہ سال تھی۔ امی کی کمرے میں آمد ہوئی۔ ”صائم! بیٹا نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مسجد میں جا کر نماز پڑھ آؤ۔“

”جاتا ہوں امی۔“ اس نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”شیراز......“ اس نے دوبارہ آواز دی جو اب تک پانی کا گلاس نہ لایا تھا۔ ”بیٹا! نماز کا وقت چلا جائے گا۔“ ”امی بس پانی پی کر جاتا ہوں۔“ امی کی آواز پر صائم نے کہا۔ ”شیراز...... جلدی آؤ۔“ اس نے اب غصے میں آواز دی۔ شیراز بھاگتا ہوا، گلاس پکڑتا ہوا آیا۔ صائم نے شیراز کے منہ پر تھپڑ دے مارا اور اسے ایسی سنائی جس نے اس کی عزت نفس کو مجروح کیا۔ امی نے اس سے پوچھا جو نماز پڑھ کر دوپٹہ اتار رہی تھیں۔ ”نماز پڑھ آئے؟“ ”نہیں امی! وہ اصل میں شیراز پانی کا گلاس دیر سے لایا جس کی وجہ سے مجھے نماز میں دیر ہو گئی۔ میں اگلی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لوں گا۔“ امی نے اسے نماز کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ہاں، ہوں میں سر ہلا کر چل دیا۔

صائم کی ایک اچھی عادت تھی کہ وہ رات کو سر پر ہاتھ رکھ کر پورے دن کی غلطیاں جانچتا تھا۔ معمول کے مطابق وہ دن بھر کی غلطیاں یاد کر رہا تھا کہ صبح کا واقعہ یاد آیا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے شیراز کی عزتِ نفس کو مجروح کیا۔ وہ اس دن کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلط کیا۔ اچانک اس کے ذہن میں شکر کی لہر آئی۔ یااللہ! تیرا شکر ہے میں کسی

کا غلام نہیں ہوں۔ ’’غلام‘‘ اس پر اس کی سوئی اٹکی رہی۔ میں دنیا میں غلام ہی تو ہوں۔ میں اللہ کا غلام ہوں۔ وہ گہری سوچ میں مبتلا ہوگیا تھا۔ آج شیراز کے منہ پر میں نے تھپڑ مارا کیوں کہ اس نے میری بات وقت پر نہ مانی اور میں نے...... میں نے بھی تو یہ...... یہی کیا۔ ہاں میں نے تو شیراز سے بھی برا کام کیا۔ اس نے تو مجھے پانی کا گلاس دیر سے لا کر دیا اور میں نے...... میں نے تو نماز پڑھی ہی نہیں۔

یہی ہے انسان جو اپنے آپ کو نجانے کیا سمجھتا ہے۔ اپنے غلاموں اور نوکروں سے تو چاہتا ہے کہ وہ اس کی ہر پکار پر لبیک کہیں۔ اپنی ہر بات ماننے کا غلاموں اور نوکروں کو حکم دیتا ہے اور جب اپنی باری آتی ہے تو پکار پر لبیک کہنے کی بجائے جان بوجھ کر اللہ کے حکم کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آج سے صائم نے تہہ دل سے فیصلہ کیا کہ وہ آج سے اللہ کے ہر حکم کو غلاموں کی طرح بجا لائے گا۔ اس کی یہ نئی سوچ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

کیا چاہتے ہو؟

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

رانا عبدالمعید، کلورکوٹ

حامد اور اسلم دونوں دہم جماعت کے طالب علم تھے اور ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اسلم کا مشغلہ ہمیشہ ملکی نظام کی خرابی پر بحث کرنا تھا۔ وہ پاکستان کے ہر نظام خواہ وہ ٹریفک سسٹم ہو یا بجلی کا نظام صنعتی نظام ہو یا تعلیم کا نظام ہر ایک کو ناقص قرار دیتا تھا جب کہ حامد اسلم سے متفق تو تھا مگر اسلم کی حرکتیں اس کو حیران کر دیتی تھیں۔ وہ خود کبھی قانون کی پاس داری نہ کرتا تھا مگر دوسروں پر نکتہ چینی کرنا اس کو بہت پسند تھا۔ ایک دن اسکول سے چھٹی کے بعد حامد نے اسلم سے کہا۔ ’’یار کیا تم مجھے میرے گھر چھوڑ دو گے؟ میرا موٹر سائیکل خراب ہے جس کی وجہ سے میں اسے نہ لا سکا۔‘‘ اسلم نے کہا کہ چلو ٹھیک ہے میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔ حامد نے فیصلہ کیا تھا کہ آج وہ اسلم کو بتائے گا کہ وہ خود ایسا کیا عمل کرتا ہے جس سے ملکی نظام بہتر ہو روڈ سے گزرتے ہوئے ایک جگہ ٹریفک سگنل پر سرخ بتی روشن ہوئی جو اس بات کی علامت ہے کہ گاڑیاں روک لی جائیں مگر اسلم ایسے گزر گیا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ مگر اتفاق سے روڈ پر کھڑے ٹریفک سارجنٹ نے اسلم کو سگنل توڑتے ہوئے دیکھ لیا اور اسلم کو پکڑنے کے لیے اس نے بھی اپنی موٹر بائیک ان کے پیچھے دوڑا دی اسلم نے جب ٹریفک سارجنٹ کو اپنا پیچھا کرتے دیکھا تو بے اختیار موٹر سائیکل کو بھگانے لگا۔ اسلم نے موٹر سائیکل بہت تیز رفتاری سے دوڑا رکھا تھا۔ حامد نے اسلم کو بار بار منع کیا کہ رک جاؤ اتنا تیز موٹر سائیکل چلانے سے کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک موڑ پر سامنے سے آنے والی ایک کار سے ان کی ٹکر ہو گئی اور اسلم کے ماتھے پر گہری چوٹ آئی اور وہ وہیں بے ہوش ہو گیا جب کہ حامد کا سر زمین پر لگ جس کے باعث وہ بھی حواس کھو بیٹھا۔ جب انہیں ہوش آیا تو وہ دونوں اسپتال میں تھے۔ اسلم کی وجہ سے حامد کو بھی بلاوجہ چوٹ آئی تھی اور اسلم کے ماتھے پر پانچ ٹانکے لگے اس کے علاوہ اس کی موٹر سائیکل کی بھی کافی توڑ پھوڑ ہوئی تھی اور ان دونوں کی جان اس طرح بچی کہ یہ کار کو بالکل سامنے دیکھ کر روڈ کے ساتھ موجود فٹ پاتھ پر کود پڑے۔ اسلم کا ماتھا زمین سے ٹکرانے کے باعث زخمی ہو گیا مگر حامد کو سر کے علاوہ اتنی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ حامد کے والد حامد کو لینے اسپتال آ گئے تھے۔ مگر جانے سے پہلے وہ اسلم کے بیڈ کے سرہانے رکا۔ اسلم کو ہوش آ چکا تھا۔ اسلم حامد کو دیکھ کر خاموش رہا اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ آج موقع تھا کہ اسلم کی آنکھیں کھول دی جاتیں کہ اس ملک کے نظام کمزور نہیں ہیں بلکہ ہم خود کمزور ہیں۔ حامد اسلم کے سرہانے بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ ’’اسلم یہ تمہاری بے وقوفی نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ تم نے ٹریفک سگنل توڑا اور قانون کی خلاف ورزی کی اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ قانون ہماری حفاظت کے لیے بنائے جاتے ہیں اور اگر ہم قانون کی پاس داری نہیں کرتے تو اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ حامد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔

’’معاشرہ افراد سے مل کر بنتا ہے اور معاشرے کی بنیادی اکائی فرد ہے اگر ایک فرد اچھے اعمال کرتا ہے تو پورے معاشرے پر اس کے براہ راست اثرات پہنچتے ہیں اور ایک فرد کی برائی پورے معاشرے کو بے چین کر سکتی ہے۔ اسلم بالکل خاموشی سے حامد کی بات سن رہا تھا۔ حامد تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا اور پھر اس نے بات دوبارہ شروع کی۔ ’’میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہر اہل وطن اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور پاکستان کی ترقی چاہتا ہے مگر یہ چاہت صرف چاہت کے لفظ تک محدود ہے۔ آج تک ہم نے ایسا کام کرنے کا نہیں سوچا جس سے ہمارے ملک کا فائدہ ہو۔ ہمیں ذاتی مفاد سے اتنا لگاؤ ہے کہ ہم اپنے ملک میں چند پیسوں کے عوض مختلف برائیاں پھیلا دیتے ہیں اور اس عمل کو رشوت کہا جاتا ہے۔

ہمیں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کو اپنانا چاہیے جس کا مطلب ہے کہ اچھے کام کی نصیحت کی جائے اور برے کام سے روکا جائے۔ ہمیں اپنی ذات میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگی پاکستان جیسا بھی ہے، ہے تو اپنا ہم اس کی اہمیت بھول چکے ہیں۔ آؤ ہم عہد کریں کہ پاکستان کو بذات خود سنواریں گے۔ حامد نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اسلم کی جانب بڑھا دیا۔ اسلم خاموش تھا مگر اس کی سوچ بدل چکی تھی وہ حقیقت تو سمجھ چکا تھا اور اس نے ایک عزم اور ولولے سے اپنا ہاتھ حامد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

اُدھم پور کے چنٹو بنٹو

نمرہ ظہور

ارے ٹھہر جاؤ، بدتمیزو، کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ابھی بتاتا ہوں۔ رک جاؤ۔ یہ چاچا اشرف کی آواز تھی جو کہ چنٹو بنٹو کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ دونوں وہاں سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ اتنے میں افضل کریانے والا وہاں آ ٹپکا۔ ارے کیا ہوگیا؟ کیوں چلاّ رہے ہو؟ چاچا اشرف نے غصے سے بھرے لہجے میں جواب دیا۔ یار وہ چنٹو بنٹو ہیں ناں۔ ان دونوں نے چپکے سے میری پگڑی کے اندر پٹاخا رکھ دیا۔ ابھی تک سر گھوم رہا ہے میرا۔ پھر چاچا اشرف اپنے بالوں کو جو کہ پٹاخا حملہ کی وجہ سے اکڑ چکے تھے، سہلاتے ہوئے گھر چلے گئے۔

ہائے میری مونچھ، نالائقو جاتے کدھر ہو؟ ٹھہرو۔ فضل دین غم و غصے سے بھرپور چنٹو بنٹو کو بھاگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں گاؤں کے تین چار آدمی وہاں آ گئے۔ کیا ہوا فضل دین؟ اور تمہاری آدھی مونچھ کہاں گئی؟ یار کیا بتاؤں۔ میں گھر کے باہر چارپائی پر سو رہا تھا۔ اتنے میں وہ دونوں اپنا کام کر گئے۔ گاؤں والوں نے حیرت سے کہا۔ وہ دونوں کون؟ تمہارا مطلب چنٹو بنٹو؟ چنٹو بنٹو کی شرارتوں سے پورا گاؤں واقف تھا۔ اس لیے گاؤں والوں کو ان دونوں پہچاننے کا ذرا بھی وقت نہیں لگا۔ فضل دین کا رونا دھونا پھر سے شروع ہو گیا۔ ان دونوں کو تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ ان دونوں نے میری مونچھ کاٹ ڈالی۔ ہائے میری پیاری مونچھ۔ گاؤں کی پنچایت میں گاؤں کے تقریباً سارے مرد جمع تھے۔ سلیم نے کہنا شروع کیا۔ گاؤں میں وارداتیں میرا مطلب شرارتیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ چنٹو بنٹو نے تو ہر کسی کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ احمد حکیم نے کہا۔ وہ دونوں اتنے شرارتی ہیں کہ ہماری کوئی بھی تدبیر ان کے آگے بیکار پڑ جاتی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا چھوڑ دینا چاہیے۔ ارے ایسے کیسے چھوڑ دیں۔ میری مونچھ کاٹ ڈالی ان دونوں نامعقولوں نے۔ فضل دین جو کہ اب تک اپنی مونچھ کا غم نہ بھلا پائے تھے۔ جھٹ سے بولے۔ علی بابا جو کہ کافی سمجھ دار تھے کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''ہمیں انہیں سمجھانا چاہیے اور تھوڑی مہلت دینی چاہیے۔'' اس طرح پنچایت تو ٹل گئی لیکن چنٹو بنٹو کی مصیبت ابھی تک نہیں ٹلی تھی۔

اگلے دن چنٹو بنٹو پھر لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ اچانک انہیں اپنے گھر کے باہر رنگ و روغن کی ڈبیاں اور ایک خوب صورت سا برش پڑا نظر آیا۔ ان کے شیطانی دماغ میں پھر سے کوئی نئی شرارت ابھری۔ وہ دونوں آصف چاچا کے اصطبل پہنچے۔ آصف چاچا وہاں موجود نہیں تھے۔ اب تو انہیں خوب موقع مل گیا تھا۔ انہوں نے آصف چاچا کے پسندیدہ سفید گھوڑے کی طرف ایک شیطانی مسکراہٹ سے دیکھا۔ انہوں نے نیلے رنگ کی ڈبی نکالی اور کہا۔ نیلے رنگ کا گھوڑا کتنا پیارا لگے گا ناں۔ انہوں نے گھوڑے کی طرب برش کر کے گھمایا ہی تھا کہ پورے گھوڑے کا رنگ نیلا ہو گیا۔ وہ دونوں حیران ہو گئے اور سمجھ گئے کہ یہ مصوری کا سامان جادوئی ہے۔ پھر نیلے گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر واپس گاؤں کی طرف چل پڑے۔ آصف چاچا واپس آئے تو پسندیدہ گھوڑے کو نیلے رنگ میں دیکھ کر انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

اب گاؤں والوں کی باری تھی۔ پورے گاؤں میں ادھم مچ گیا۔ گاؤں ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ عمیر چاچا اپنی گندم کی فصل کو سرخ رنگ میں دیکھ کر غضب ناک ہو گئے۔ گاؤں کی گلیاں اورنج کلر کی اور گاؤں کی خاص سرخ پہاڑی، اب سبز پہاڑی بن چکی تھی۔ سلیم چودھری جو کہ ہمیشہ سفید کپڑے ہی پہنا کرتا تھا۔ اپنے کپڑوں کو گلابی دیکھ کر غصے سے بھر گیا۔ گاؤں کی ہری بھری فصلیں اب جامنی، سرخ اور گلابی رنگوں سے بھر چکی تھیں۔ پورا گاؤں ایک قوس قزح (دھنک) کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ بھی جامنی، سبز، سرخ، پیلے کلرز کے دکھائی دے رہے تھے۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ اس شرارت کے پیچھے چنٹو بنٹو کا ہاتھ ہے۔ چنٹو بنٹو گاؤں کی گلیوں میں گھومتے ہوئے لوگوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ارے وہ دیکھو جامنی رنگ کا گدھا۔ چنٹو بنٹو

نے اپنے قہقہے بلند کیے۔ اس طرح انہوں نے تقریباً سبھی لوگوں کو اپنے مذاق کا نشانہ بنایا۔ لوگ غم و غصے سے بھرپور تھے۔ اچانک آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے۔ پھر بادل گرجے، بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سارا رنگ بارش کے پانی سے بہہ گیا۔ گاؤں پھر سے پہلے جیسا ہو گیا۔ بادل ہوا کے زور سے دور چلے گئے اور بارش تھم گئی۔ چنٹو بنٹو بارش کی وجہ سے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ بارش تھمنے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکلے۔ جوں ہی وہ دونوں گلی میں داخل ہوئے ان کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ دونوں دھڑام سے زمین پر آ گرے۔

وہ دونوں کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ رنگ کی ساری ڈبیاں ان پر آ پڑی تھیں اور سارے رنگ ان پر گر چکے تھے۔ وہ دونوں سر سے پاؤں تک رنگوں میں بھیگ چکے تھے۔ ان دونوں کی یہ دیکھ کر خوف سے چیخ نکل گئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ہنس رہے تھے اور ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ دونوں بہت شرمندہ ہوئے۔ انہیں احساس ہوا کہ مذاق کا نشانہ بننے پر کیسا لگتا ہے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے معافی مانگی اور شرارتیں کرنے سے توبہ کر لی۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

محنت کی عظمت

حسن رضا سردار وصفی، کاموکی

اس کا نام جرجیس تھا۔ وہ ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ لوہے کا کام ان کا آبائی پیشہ تھا۔ اس کے ابو لوہے کے چھوٹے چھوٹے اوزار بنایا کرتے تھے۔ جن کی آمدنی سے ان کے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ جرجیس کے ابو اسے بھی لوہار ہی کا کام سکھانا چاہتے تھے لیکن وہ محنت سے بہت جی چراتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے بھی الہ دین کا چراغ یا عمرو عیار کی زنبیل مل جائے جس کی مدد سے وہ راتوں رات بغیر کسی محنت اور مشقت کے امیر ہو جائے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے۔

ایک دن وہ اپنے گاؤں کے باہر کھیتوں میں کھیل رہا تھا کہ اچانک دو گھڑ سوار نقاب پوش آئے اور اسے بے ہوش کر کے لے گئے۔ جرجیس کو جب ہوش آیا تو یہ جان کر گھبرا گیا کہ وہ بردہ فروشوں کے چنگل میں ہے اور بحری جہاز کے ایک کیبن میں بند دوسرے لڑکوں کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ وہ خوف سے رونے لگا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنی سلامتی کی دعا مانگی۔

بحری جہاز اپنے سفر پر رواں دواں تھا کہ اچانک طوفان آ گیا۔ جہاز سمندر میں کسی تنکے کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔ ملاحوں نے جہاز کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن بحری جہاز ان کے قابو سے باہر ہو گیا اور سمندر میں ابھری ہوئی ایک چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

جرجیس بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ سمندر میں گر پڑا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہمت ہار دی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرنے سے نہیں بچا سکتی، لہٰذا اس نے غوطے کھاتے ہوئے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے۔

اچانک جہاز کا ایک تختہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے تختے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس پر سوار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ طوفان تھم گیا۔ اس کا تختہ لہروں پر بہتا ہوا ایک جزیرے پر پہنچ گیا۔ جزیرے پر کھجور کے بے شمار درخت لگے ہوئے تھے۔ جرجیس کو بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک درخت پر چڑھ کر کھجوریں توڑ کر کھائیں اور اپنا پیٹ بھرا۔

اسے تین ماہ جزیرے پر رہنا پڑا۔ وہ اسی طرح درختوں سے کھجوریں اتار کر اور چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کا شکار کر کے پیٹ بھرتا۔ وہ روز ساحل پر جا کر لکڑیاں جلاتا تا کہ اگر دور سے کوئی بحری جہاز گزرے تو دھواں دیکھ کر ادھر آ جائے۔ جزیرے پر رہ کر اپنا ہر کام خود کرنے کی وجہ سے وہ سلیقہ مند اور محنتی ہو گیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ محنت سے ہی آدمی کچھ کر سکتا ہے۔

ایک دن جرجیس ساحل پر آگ جلا کر سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے دور سے ایک جہاز سمندر میں تیرتا نظر آیا۔ جرجیس نے جلدی سے ڈھیر سارے پتے اٹھا کر آگ میں ڈالے اور اپنی قمیص اتار کر ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر لہرانے لگا۔

جرجیس اونچی آواز میں جہاز والوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ عرشے پر کھڑے لوگوں نے اسے قمیص لہراتے دیکھا تو کپتان کو بتایا۔ کپتان جہاز کو ساحل کے قریب لے آیا۔ پھر ایک کشتی میں بٹھا کر جرجیس کو جہاز پر سوار کر لیا گیا اور بعد میں اسے اس کے ملک کے ساحل پر اتار دیا گیا۔ جرجیس کو محنت کی عظمت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے دل لگا کر کام کیا اور اپنی محنت کے بل بوتے پر جلد ہی وہ ملک کا امیر ترین تاجر بن گیا۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کبھی نہ بھولوں گا

کاشف ضیائی

پیارے بچو! آج میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک ایسا واقعہ سناتا ہوں جو دل چسپ ہونے کے علاوہ بہت حیرت انگیز بھی ہے۔ یہ پاکستان بننے سے سات، آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت چھوٹا بچہ تھا، اتنا چھوٹا کہ جتنے چھٹی ساتویں کے بچے ہوتے ہیں آج کل۔ میرے والد اور چچا اس زمانہ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ حج چھوٹے بچوں کے ذمے تو نہیں لیکن مجھے اس بات کی اتنی خوشی تھی کہ بتا نہیں سکتا۔

کراچی سے ہم بحری جہاز پر سوار ہوئے۔ ہمارا جہاز دخانی تھا۔ دخانی اس زمانے میں دھواں چھوڑنے والے جہاز کو کہتے تھے۔ ایسے جہاز کے عرشے پر چمنیاں بنی ہوتی تھیں جن سے کالا دھواں خارج ہوتا تھا۔ اب ایسے جہاز نہیں ہوتے۔ سفر شروع ہوئے ابھی دوسرا روز تھا کہ مجھے ایک مشکل ہو گئی۔ وہ یہ کہ مجھے ہر وقت متلی رہنے لگی۔ جو لوگ پہلی بار سمندر کا سفر کریں انہیں اکثر یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ جی متلاتا ہے اور قے والی کیفیت رہتی ہے۔ بہرحال اس مشکل کا حل ایسے نکلا کہ ایک بڑھیا نے مجھے خشک آلو بخارے دے دیئے جنہیں چوس کر میں گزارا کر لیتا۔ یوں آہستہ آہستہ ہمارا جہاز منزل کی طرف بڑھتا گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنے دن سمندر کا سفر رہا البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز کپتان کی طرف سے اعلان ہوا کہ جدہ کا ساحل آ گیا ہے۔ سارے جہاز میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہم سارے شوق شوق میں جہاز کے عرشے پر چڑھے کہ ساحل دیکھیں لیکن وہاں تو چاروں طرف پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ ساحل ابھی کئی میل دُور ہے یہاں سے ہم کشتیوں پر آگے خشکی تک جائیں گے۔

دراصل اس زمانے میں جدہ کی بندرگاہ نہ بنی تھی۔ جہاز زمین سے پانی میل دور سمندر میں ہی ٹھہرتے تھے۔ وہاں سے کشتیوں کے ذریعے حاجیوں اور ان کے سامان کو ساحل تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ عمل دل چسپ بھی ہوتا تھا اور تکلیف دہ بھی۔ بعد میں جب سعودی عرب میں تیل نکلا تو جدہ میں بندرگاہ بھی بنی اور ائیر پورٹ بھی۔

دو دن ہم نے وہیں گزارے۔ ان دو دنوں میں کھانے کو کچھ نہ ملا سوائے اونٹنی کے گوشت کے۔ عربی لوگوں کی عادت ہے کہ مرچ مصالحے بہت تیز کھاتے ہیں اور آج تک ان کی یہ عادت ویسے کی ویسے ہی ہے۔

دو دنوں بعد بسوں کے ایک قافلے میں جگہ ملی جو مکہ جا رہا تھا۔ ہمارے قافلے میں آٹھ بسیں شامل تھیں۔ ہماری بس سب سے آخری تھی۔ اب ہمارا زمین کا سفر شروع ہوا۔ سفر معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ تارکول کی ایک سڑک تھی جس پر قافلہ رواں دواں تھا اور اردگرد خشک ٹیلے پھیلے ہوئے تھے جن پر ریت اُڑ رہی تھی۔

میرے ساتھ ایک حاجی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، کالے سے، موٹے سے، بھدے سے۔ جب سے سفر شروع ہوا انہوں نے میرا دماغ چاٹنا شروع کیا۔ کبھی کہتے یہ میرا چوتھا حج ہے، میں اس سے پہلے تین حج کر چکا ہوں، کبھی کہتے ہندوستان کے فلاں فلاں شہر میں میری اتنی جائیداد ہے، کبھی کہتے کہ مجھے اتنی عربی آتی ہے کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ کبھی کہتے فلاں لیڈر سے میں اتنی اتنی بار مل چکا ہوں۔

غرض اس طرح کی شیخیاں بگھار کر انہوں نے میرے دماغ میں درد کر دیا۔ میں کچھ دیر تو ان کی باتیں سنتا رہا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ایک سے مناظر تھے۔ ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے جن پر سبزے نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ حاجی صاحب اٹھے اور ڈرائیور کے پاس چلے گئے۔ نہیں معلوم انہوں نے ڈرائیور کے کان میں کیا پھونکا کہ ڈرائیور نے بس باقی بسوں سے ہٹا کر ایک اور راستے پر ڈال دی جو بڑی سڑک سے دائیں جانب کو نکلتا تھا۔ حاجی صاحب واپس آ کر کہنے لگے کہ میں نے اس سے کہا ہے کہ تجھے سو روپے دوں گا، ہمیں کسی شارٹ کٹ راستے سے مکہ پہنچا دے۔

سو روپے اس زمانہ میں بڑی رقم تھی اور ڈرائیور بھی شاید حرص کا مارا تھا۔ وہ لالچ میں آ گیا اور بس کو دوسری بسوں سے ہٹا کر دوسری طرف لے گیا۔ بس بیس پچیس منٹ چلتی رہی پھر ٹھک سے رک گئی۔ معلوم ہوا آگے راستہ بند ہے۔ ڈرائیور بس روکے تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اچانک چلایا۔ ”اس طرف ہے راستہ۔“ پھر اس نے بس اس طرف موڑی جس طرف اس کے خیال میں راستہ تھا۔ بیس، بائیس منٹ بعد پھر رک گیا کہ آگے پھر راستہ نہیں ہے۔ اتنے میں ایک سواری نے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ مکہ اس طرف ہے اگر ہم اس طرف چلیں تو یقیناً مکہ سے قریب ہو جائیں گے۔ ڈرائیور کو اس کی بات سمجھ آ گئی اور اس نے اسی سمت میں بس بھگا دی لیکن پندرہ منٹ بعد یہاں بھی وہی کچھ ہوا جو اس سے پہلے دو مرتبہ ہو چکا تھا۔

اب ڈرائیور بس روکے سوچ رہا تھا کہ کدھر کو جائے۔ تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد اسی نے فیصلہ کیا کہ واپس چلنا چاہیے۔ اس کے خیال میں جس طرف سے ہم آئے تھے اگر اسی طرف سے واپس جا کر بڑی سڑک پر چڑھ جاتے تو ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو سکتا تھا۔

چناں چہ بس واپس موڑی گئی لیکن یہ ترکیب بھی فیل ہوئی کیوں کہ اب حالت یہ تھی کہ ہم کبھی ایک ٹیلے پر چڑھتے کبھی دوسرے پر۔ ہر ٹیلے کے بعد ڈرائیور اگلی سمت اس امید سے دیکھتا کہ شاید اس ٹیلے کے پیچھے سڑک ہو لیکن وہاں خشک اڑتی ہوئی ریت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

اتنی دیر تک مسافروں کو بھی سمجھ آ چکی تھی کہ ہم راستہ کھو بیٹھے ہیں اور صحرا میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔

وہ وقت عجیب تھا۔ ہر شخص خوف زدہ سا ہونے لگا تھا۔ گاڑی میں بعض بچے تھے، وہ رونے لگے۔ ان کی مائیں انہیں چپ کرواتیں پھر اللہ کا ذکر کرنے لگتیں۔ بعض بوڑھے تھے، ان کی حالت ایسی ہو گئی جیسے ابھی دل کا دورہ پڑے گا۔ ہر شخص حیران، پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا ہمارا کیا بنے گا؟

ایسے میں ڈرائیور نے بس روک دی۔ بعض مسافر اسے کوسنے دے رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر یہ طعنے سنتا رہا پھر وہ بھی جھلا گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ پانی سب کے پاس ختم ہو چکا تھا۔ ڈرائیور اور مسافر آپس میں لڑ رہے تھے۔ بچے رو رہے تھے اور مائیں فریاد کر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد یہ کیفیت بھی ختم ہو گئی کیوں کہ ہر شخص کا گلا رندھ گیا اور بولنے کی سکت ختم ہو گئی۔ پہلے پسینہ آ رہا تھا پھر پسینہ آنا بھی بند ہو گیا۔ پیاس سے ہماری بری حالت تھی۔ ایسے میں میں اپنے چچا کے ساتھ نیچے اترا لیکن نیچے کا حال اس سے بھی بُرا تھا۔ گرم لُو تھپڑ کی طرح چہرے پر آ کر لگتی تھی۔ سایہ وہاں کہاں سے ہوتا؟ لے دے کے بس کے نیچے کچھ سایہ تھا لیکن وہاں کی زمین تندور کی طرح تپ رہی تھی۔ سب خاموش تھے اور سب خوف زدہ، سب کو یقین ہو گیا کہ ہماری موت یہیں آئے گی۔

ایسے میں نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتی تھیں کہ شاید اللہ کی امداد آ جائے اور اسی وقت وہ واقعہ پیش آیا جسے میں بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھول سکتا۔ 80 سال ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی یادیں آج بھی میرے دل میں ایسے تازہ ہیں جیسے کل کی بات ہو۔

ٹیلے کے دوسری جانب سے ایک جوان مرد نکل کر ہمارے سامنے آیا جو ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے سبز لباس پہنا ہوا تھا اور خود بھی بڑا خوب صورت اور صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ اس

کے لمبے بال تھے اور چہرے پر بڑی رونق تھی یقین کیجئے وہاں نہ کوئی درخت تھا، نہ کوئی سایہ اور نہ کوئی عمارت لیکن اس کے جسم پر سفر کے کوئی اثرات نہ تھے وہ بالکل تازہ دم تھا اور ٹیلے سے اترتا اترتا سیدھا ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے کپڑوں سے ایسی خوش بو اٹھ رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اس نے ہمارے سامنے ٹھہر کر ایک طرف اشارہ کیا۔ سب نے سمجھ لیا کہ راستہ اس طرف ہے پھر وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ اس کے گھوڑے کو سیدھے ٹیلے پر چڑھنے میں کوئی دشواری نہ آ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ تب سب کو ہوش آیا کہ ہم نے کیا دیکھا۔ سب اس کی شان و شوکت سے متاثر تھے۔ میں نے خود بھی ایسا رعب داب والا آدمی کبھی زندگی میں نہ دیکھا تھا۔

بہرحال سب لوگ جلدی جلدی سوار ہوئے اور ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر کے بس اسی سمت میں بھگا دی جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ دس منٹ میں ہی بڑی سڑک ہماری نظروں کے سامنے تھی۔

اس وقت ہماری خوشی کا اندازہ صرف وہ شخص لگا سکتا تھا جس نے اس سے پہلے ہمیں پریشانی میں دیکھا ہو۔ ڈرائیور نے اسپیڈ بڑھائی اور دس منٹ بعد ہی ہمیں ہمارا قافلہ مل گیا۔ اس کے بعد پھر سفر اس طرح شروع ہو گیا جیسے کبھی ہم جدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ دوسرے لوگوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں میں البتہ اس وقت سے اسی شخص کو سوچے جا رہا تھا۔ اس کا سینہ چوڑا اور بازو مضبوط تھے اور وہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتا تھا۔

ایسے میں ایک بڑے میاں نے کہا۔ ''جانتے ہو وہ آدمی کون تھا، جس نے ہماری راہ نمائی کی تھی۔'' سب لوگ چپ بیٹھے رہے۔ کسی نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ پھر بڑے میاں خود ہی بولے۔ ''وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، انہیں اللہ نے بھیجا ہو گا ہماری مدد کے لیے۔''

میں ان کی بات نہ سمجھا۔ میں نے چاچو سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' چاچو نے جواب دینے کی بجائے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا۔

ہوتے ہوتے ہم مکہ پہنچ گئے۔ اس زمانے کا مکہ، آج کے مکہ جیسا نہ تھا۔ آج تو اس شہر میں بڑی بڑی عمارتیں ہیں اس زمانہ میں صرف کھجور کے جھونپڑے تھے۔

مسجد حرام بھی ایسی نہ تھی، بیت اللہ کے ارد گرد کی زمین کچی تھی۔ طواف کرتے ہوئے کنکریاں بہت چبھتی تھیں۔ اگر کبھی بارش آ جاتی تو پانی خانہ کعبہ کے ارد گرد اکٹھا ہو جاتا۔ ایسی حالت میں بعض اللہ والے تیر کر طواف کرتے۔ رہائش کا ایسا سلسلہ نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ حرم کے گرد دور دور تک بس خیمے ہی خیمے ہوتے۔ زم زم کا کنواں بھی ایسا نہ تھا۔ چاروں طرف ایک منڈیر تھی اور درمیان میں کنواں۔ پانی نکالنا خاصا مشکل ہوتا تھا۔ اللہ بھلا کرے افریقہ کے حبشیوں کا کہ جان لگا کر پانی نکالتے، خود بھی پیتے اوروں کو بھی پلاتے۔ ان دنوں حرم میں شیخ عبداللہ حریری نماز پڑھاتے تھے۔ لوگ انہیں ''شیخ حرم'' بھی کہتے تھے ان ہی دنوں میں ایک روز میرے چاچو نے انہیں وہ سارا واقعہ سنایا جو ہمارے ساتھ صحرا میں بیتا تھا۔

جتنی دیر وہ تفصیل بیان کرتے رہے شیخ کے چہرے پہ ایک رنگ آتا ایک جاتا رہا۔ آخر میں انہوں نے کہا ''رات کو میرے حجرے میں آ جائے گا۔'' رات کو جب ہم ان کے حجرے میں پہنچے تو وہ پندرہ، سولہ عربی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی انہوں نے ساری تفصیل دوبارہ پوچھی۔ جب سن چکے تو کہنے لگے۔ ''محترم! جو حلیہ آپ نے بیان کیا ہے وہ حضرت خضر علیہ السلام ہی کا ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ نے ان کی زیارت کر لی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے۔'' میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟ بعد میں چاچو نے بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نیک مخلوق ہیں جو انسانوں کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں اور جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ میں بھٹک جانے والوں کی راہ نمائی کرتے ہیں۔

جتنے دن ہم مکہ میں رہے ہم نے سب کو یہ واقعہ سنایا پھر جب برصغیر واپس آئے تو بھی سب کے سامنے بیان کیا۔ کچھ لوگوں نے اسے سن کر حیرت کا اظہار کیا، کچھ نے مبارک بادیں دیں اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اسے جھوٹ سمجھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میں نے بچپن ہی میں حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھ لیا تھا۔ بعد میں میں نے ہزاروں دعائیں کیں کہ ایک مرتبہ پھر زیارت ہو جائے لیکن پھر کبھی ایسا نہ ہوا۔ وہ دوبارہ کبھی نظر نہ آئے۔

☆☆☆

آیئے مسکرائیں

ایک دیہاتی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں گیا اور چائے پینے کی خواہش ظاہر کی، ویٹر چائے کی چھوٹی سی پیالی میں چائے لے آیا جو دیہاتی نے ایک گھونٹ میں ختم کر دی اور ویٹر سے مخاطب ہوا۔ ''بھئی میٹھا ٹھیک ہے چائے لے آؤ۔''

☆

ایک ڈاکٹر (وکیل سے): ''جناب! آپ کی ذراسی غلطی سے انسان دوفٹ اوپر لٹک سکتا ہے۔''

وکیل: ''اور جناب! آپ کی ذراسی غلطی سے انسان دوفٹ نیچے زمین میں ہوسکتا ہے۔'' (مائزہ حنیف، بہاول پور)

استاد (شاگرد سے): ''چیئرمین کسے کہتے ہیں؟''

شاگرد: ''جناب! کرسیاں بنانے والے کو۔''

☆

وکیل (ملزم سے): ''تم نے پولیس افسر کی جیب میں جلتی ہوئی سگریٹ کیوں ڈالی تھی؟''

ملزم: ''انہوں نے خود کہا تھا کہ اگر کام کروانا ہے تو پہلے میری جیب گرم کرو۔'' (محمد ارسلان رضا، کہروڑ پکا)

ایک انگریز نے ایک دیسی نوکر رکھا۔ ایک دن نوکر نے کوئی غلط کام کیا تو انگریز نے کہا۔ ''فول۔'' نوکر سمجھا ''پھول'' اور وہ بھاگتا ہوا باغ میں گیا اور پھول توڑ لایا۔ انگریز نے جب دیکھا تو غصے سے کہا۔ ''بلڈی فول'' نوکر نے کہا۔ ''جناب باغ میں دیسی پھول ہی ہیں۔ ولایتی نہیں ہیں۔''

☆

پہلا افیمی: ''ارے! آپ کا تو انتقال ہو گیا تھا۔''

دوسرا افیمی: ''جی ہاں۔''

پہلا: ''پھر کیسے آنا ہوا؟''

دوسرا: ''کیا بتاؤں، گرمی بہت تھی قبر میں۔ بس چلا آیا۔''

(احور کامران، لاہور)

ایک لڑکا ساتویں کلاس میں پڑھا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کلاس میں صرف تین لڑکے تھے۔ جب ان کا سالانہ امتحان ہوا تو ان میں سے ایک لڑکا تھرڈ آیا۔ وہ خوشی خوشی اپنے باپ کے پاس گیا اور اس کو خوش خبری سنائی۔ باپ نے سنا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ بیٹا، تم کتنے لڑکوں میں سے تھرڈ آئے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ ''ابا جان! میں صرف تین لڑکوں میں سے تھرڈ آیا ہوں۔''

☆

ڈاکٹر (مریض کی نبض دیکھتے ہوئے): ''تم تو بالکل ٹھیک ہو۔ تمہاری نبض تو گھڑی کی طرح باقاعدہ چل رہی ہے۔

مریض: ''آپ درست فرماتے ہیں لیکن آپ نے میری گھڑی پر انگلیاں رکھی ہوئی ہیں۔''

(کظیمہ زہرہ، لاہور)

ننھا دوائی نہیں پی رہا تھا۔ ماں نے کہا۔ ''بیٹا، میری خاطر ہی پی لو۔ دیکھو۔ میں تمہاری خاطر ہر کام کرتی ہوں۔

ننھے نے پوچھا۔ ''ہر کام..... امی؟''

ماں نے کہا۔ ''ہاں بیٹا، ہر کام۔''

ننھا بولا۔ ''تو پھر میری خاطر آپ یہ دوا بھی پی لیں۔''

☆

ننھا جاوید دوڑتا ہوا آیا اور امی سے بولا۔ ''امی، اچار کے مٹکے میں ایک چوہا پڑا ہے۔''

امی بولیں۔ ''بیٹا، تم نے اسے باہر نکال دیا؟''

ننھے نے کہا۔ ''نہیں امی۔ میں نے اس میں بلی ڈال دی ہے۔''

☆

امی (غصے سے) رشید! تم تینوں سیب کھا گئے۔ میں نے کہا تھا، ایک کھانا۔

رشید (بھولے پن سے) مگر آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کون سا کھانا۔ اس لیے یہ سوچ کر میں تینوں ہی کھا گیا کہ ان میں سے کوئی تو میرا ہوگا۔ (اُم حبیبہ، کوئٹہ)

☆☆☆

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

تعلیم و تربیت کا شمارہ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی بڑے جنگل سے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور کوئی ایسا قصبہ نظر آ جائے کہ جان میں بھی جان آ جائے۔ رسالے تو بہت سے دیکھے ہیں لیکن تعلیم و تربیت جیسا رسالہ آج تک کہیں بھی نہ ملے گا۔ اگست کا شمارہ اتنا اچھا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ تعلیم و تربیت کے اس شمارے کو اپنے دل میں بسا لوں۔ اس بار شمارہ اتنا اچھا تھا کہ میرے بہن بھائیوں، تایا اور خاص طور پر میری امی نے بھی پڑھا جو کبھی بھی کوئی رسالہ نہیں پڑھتیں۔ یہ میرا پہلا رسالہ ہے جو میں پورے چار سال سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ اگست کے شمارہ میں کہانیاں اتنی سپرہٹ تھیں کہ دل نے بھی آہ بھر لی۔ یہ میرا پہلا خط ہے جو میں بھیج رہا ہوں۔ ضرور شائع کیجئے گا۔

(محمد حبیب احمد، وجھیانوالہ)

اگست کا شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب اور بے مثل رہا۔ مجھے اس رسالے کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ آپی، میں آپ سے ناراض ہوں۔ کافی عرصہ سے میری کوئی تحریر اس شمارے کا حصہ نہیں بنی جو میں بہت شوق سے بھیجتی ہوں۔ اب میں بہت امید سے لکھ رہی ہوں تا کہ میرا خط شائع ہو سکے۔ اس شمارے کی تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ہر موضوع سبق آموز ہوتا ہے۔ اب اس امید سے خط ختم کرتے ہیں کہ یہ خط اس دفعہ ردی کی ٹوکری کا حصہ نہیں بنے گا۔

☆ خط کے علاوہ اپنی تحریریں بھی بھیجیں۔ (شائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی)

اگست 2017ء کے شمارے کا ٹائٹل دیکھا تو دل کی کلیاں مہک اٹھیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھ سمیت تمام قارئین کو یہ معلوم ہے کہ آپ اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کی کوشش ہوتی ہے کہ میگزین کو خوب صورت سے خوب صورت بنایا جائے۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن ہمیں تعلیم و تربیت پڑھنے کے لیے خصوصی وقت نکالنا ہوتا ہے۔ جون اور جولائی کے شمارے میں تو مجھے اپنا خط کہیں نہ ملا لیکن اس دفعہ بڑی امید سے لکھ رہا ہوں کہ ردی کی ٹوکری سے بچا رہے گا۔ آلو ماسٹر، اڑان، نیلی چڑیاں سپرہٹ کہانیاں تھیں۔ میں تقریباً سبھی سلسلوں میں حصہ لینے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔ اس دفعہ بھی بھرپور تیاری کے ساتھ بہت کچھ ارسال کر رہا ہوں۔ اب مجھے اجازت، خدا حافظ..... لیکن ساتھ ہی آخری شعر

اٹھایا ہے قلم لکھا میں نے خط اس لیے
شائع ہو گا تعلیم و تربیت میں بڑی امید ہے

(محمد شماس حسین، بہاول پور)

آپی صاحبہ! کیا حال ہے آپ کا؟ امید نہیں یقین ہے کہ خیریت سے ہوں گی اور میں بھی خیریت سے ہوں۔ آپ میرے بغیر اداس نہیں ہوئی ہیں کیا؟ میں تو تعلیم و تربیت میں خط لکھے بغیر بہت اداس ہو گئی تھی۔ دراصل مجھے موقع ہی نہ ملتا تھا لکھنے کا، کچھ دن اور تاریخ بھول جاتی تھی اور ویسے بھی خط جتنی بار بھی لکھو شائع ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرا دل اچاٹ ہونے لگ گیا لیکن پھر میں نے خود کو منا کر تعلیم و تربیت کے لیے خط لکھنا شروع کیا اور ہاں! ارے...... میں ردی آنٹی کو سلام کرنا تو بھول ہی گئی۔ اوہو! چلیں اب کر لیتی ہوں۔ السلام علیکم ردی آنٹی جی! کیا حال ہے؟ خوب خطوط کھا رہی ہوں گی۔ مجھے لگتا ہے آپ کافی موٹی ہو گئی ہیں، لہٰذا مزید خطوط نہ کھائیں ورنہ پھٹ جائیں گی بدہضمی سے اور میرا خط تو بدہضمی سے بھرا پڑا ہے لہٰذا اسے نہ ہی کھائیے گا۔ بس میری آپ سے یہی گزارش تھی۔ اب مجھے ایڈیٹر صاحبہ سے کلام کرنے دیں، یہ نہ ہو کہ سارا خط آپ اور میری گفتگو بازی سے بھر جائے اور پھر میں آپ کے پاس ہی آ جاؤں۔ نہ...... نہ...... نہ! میں آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔ اوکے بائے بائے! اونہہ سمجھ رہی تھی کہ میں آنٹی کی تعریف کر رہی ہوں لیکن ان کو کیا پتا ہو کہ...... ارے ارے آپی آپ مجھے سن رہی ہیں۔ معاف کریں میں نے کچھ نہیں کہا۔ ان کو مت بتانا ورنہ میں بھی...... میں ان کے پاس نہیں جانا چاہتی اور ہاں، تو ہم کہاں تھے؟ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ یوم آزادی کے حوالے سے تعلیم و تربیت سوپر ڈوپر تھا۔ ساری کہانیاں آزادی کے حوالے سے بھرپور اچھی اور مزیدار تھیں۔ بس کیا کریں معیار ہی اچھا ہے کہ روٹھ کر ہم پھر واپس آ گئے اپنے اس رسالے کے

پاس۔ میرے اتنے لمبے خط کی وجہ سے ردی آنٹی کے ساتھ کہیں آپ بھی میری مخالف نہ ہو جائیں۔ اس لیے اجازت چاہوں گی۔ اب جواب ضرور دیں میرے خط کا اور شائع کر دینا پلیز، ورنہ پھر سے میں رسالے سے ناراض نہیں رہ پاؤں گی۔ اللہ حافظ!

☆ آپ کا ردی نامہ شائع کر دیا ہے۔ خوش......! اور جی ہاں، پیاری مومنہ! ہم واقعی آپ کے لیے اداس تھے۔ باقاعدگی سے شامل ہوا کریں۔

(مومنہ عامر حجازی، لاہور)

آپی جان! آپ کی خدمت میں حاضر ہے آپ کی سویٹ سی شاعرہ...... اپنے سویٹ...... میرا مطلب شیطان کی آنت جتنا لمبا خط لیے...... ویسے تو آپ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ مجھے مبہوت کرنے والی کیا چیز تھی؟ وہ تھا ہمارا پیارا ''تعلیم و تربیت'' ہماری فوراً دوڑ لگی۔ دروازے پہ پہنچے تو امی کے چمکتے دمکتے چہرے پر چمکتی دمکتی مسکراہٹ تھی۔ وہ بولیں۔ ''مبارک ہو عیشہ! آپ کی ڈرائنگ کو پہلی پوزیشن ملی ہے۔'' میرے تو حواس ہی گم ہو گئے...... ڈر سے نہیں خوشی سے۔ فوراً صفحہ نکالا اور دیکھنے لگی۔ ''اب تو مجھے 195 روپے کی کتابیں ملیں گی۔ میں بھی شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ بنانے لگی۔ بچو! پچھلی بار جب میرا خط شائع ہوا تھا تو پہلی بار تو میرے ابو نے مجھے بیس کتابیں تحفے میں دی تھیں۔ اب پھر کتاب کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابو سے نہیں...... آپ سے۔ چلیں جب ہماری گاڑی پہنچی ''آپ بھی لکھیے'' پر تو میرے حواس ہی گم ہو گئے۔ پہلے کی طرح خوشی سے نہیں غم سے...... ہماری کہانی ''ایثار'' شامل نہیں تھی۔ خیر، غم کو سمیٹتے ہوئے گاڑی روانہ ہو گئی خطوط پر...... اب تو غم کا لاوا پھٹ پڑا یعنی آنسو نکل آئے کیوں کہ خط شامل نہ تھا۔ مجھے وجہ سمجھ آ گئی کہ تحاریر غلط پتے پر پہنچ گئیں کیوں کہ 32 ایمپریس روڈ دو جگہ ہے، لہٰذا واضح طور پر ایڈریس شائع کریں اور اگر آپ نے یہ خط شائع نہ کیا تو غم کا لاوا کنٹرول کیسے ہوگا؟ کوئی بات نہیں ہمت ہے میرے اندر 15 جولائی کو مجھے کتاب ''عبدالرحمٰن کی دھلائی'' مل گئی۔ میں باقی کتابیں خریدنا چاہتی ہوں۔

اے خدا مجھے کوئی خدائی نہ دے
مجھے اپنے تعلیم و تربیت کے سوا کوئی دکھائی نہ دے

(عیشہ الراضیہ، لاہور)

☆ پیاری سی عیشہ! آپ فون پر رابطہ کر سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ہمارا سلام قبول ہو
سدا خوش رہیں زندگی طویل ہو

لمبا لکھا، چھوٹا لکھا، مزاحیہ لکھا، سنجیدہ لکھا، مزاح سے بھرپور لکھا، یعنی ہر اچھی قسم کا لکھا، طنزیہ نہیں لکھا، اوٹ پٹانگ باتوں والا نہیں لکھا۔ آپ کی تعریف نہ کرنے والا نہیں لکھا، مشکل الفاظ میں نہیں لکھا، سمجھ میں نہ آنے والا نہیں لکھا، انگلش میں نہیں لکھا، یعنی ہر بڑی قسم کا نہیں لکھا، اپنا خط چھپوانے کے لیے ہر حربہ آزمایا، سب کچھ کیا چھپوانے کے لیے، ڈاک خانے تک بھیجا چھپوانے کے لیے، اپنے وقت میں سے وقت نکال کر آپ کو خط لکھا چھپوانے کے لیے لیکن بے سود...... اور ہاں! میرے اس خط کو پڑھنے سے پہلے اپنے پاس کھڑی ٹوکری کو ڈانٹیں کہ پہلے بھی اس بہن کے چار پانچ خط کھا کر آپ کا پیٹ نہیں بھرا اور اب بھی خط کھولنے سے پہلے ہی پاؤں اٹھائے اور آنکھیں پھاڑے دیکھنا شروع کر دیا۔ تعلیم و تربیت کی تعریف میں لکھا ہر جملہ بڑے بڑے مضمون پر بھاری ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کی تعریف کرنا سمندر سے موتی، مونگے لا کر صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے برابر ہے۔ پورا نہیں تو تھوڑا سا خط ضرور شامل کر دیں۔ فقط آپ کی ناراض قاری!

(عیشہ فاطمہ، فیصل آباد)

امید ہے تعلیم و تربیت کا سب عملہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بخیریت ہو گا۔ ماہ اگست کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور معلومات افزا تھا۔ کہانیاں اور تحریریں سب ہی اچھی تھیں خاص طور پر ''جب پاکستان بنا، کام یاب لوگ، بڑھیا کی بددعا، آزادی انمول نعمت'' بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ رسالہ عرصہ سے پڑھ رہا ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ شائع فرمائیں تاکہ اس دل چسپ پرچہ میں مزید کچھ لکھنے کی جسارت کر سکوں۔

(محمد سالار، گوجر خان)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اپنی تحریروں کے ساتھ ضرور شرکت کریں۔

جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں:

محمد الیاس بھٹی، وہوا۔ صفا تصور، آزاد کشمیر۔ مصباح صدف مبشر، جھنگ۔ عفان عمار، ام ایمن گڑیا، عبدالمغنی، وقاص، محمد عمر ملتان۔ روشن نظر، لاہور۔ طلحہ خباب علی، چکوال۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ سید کمیل عباس، لاہور۔ نادیہ رفیق، وجھیانوالہ۔ لائبہ کنول، پلوشہ خٹک، پشاور۔ وردہ ایوب، ابوبکر جاوید، لالہ موسیٰ۔ سمیع اللہ، عینیہ، واہ کینٹ۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ عفان رشید، قصور۔ نعمان اکرم، اوکاڑہ۔ حذیفہ اظہر، عائشہ قمر، فیصل آباد۔ محمد نعمان زیب، صبا عامر، شائزہ عامر، راول پنڈی۔ خواجہ اویس احمد، آزاد کشمیر۔ عائشہ شہباز، وہاڑی۔ نور العین عینی، اسد اللہ خان، حفصہ فرقان، زوحا اشفاق، رابعہ اشفاق، محمد سہیل، خدیجہ زبیر، محمد بلال، محمد عمر فاروق، حنا زیب، کراچی۔ عندلیب صحرائی، اسلام آباد۔ سعدیہ عروج، مومنہ مقصود۔ جاوید اقبال طور، جلال پور جٹاں۔

پیارے بچو! ترکیہ ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان ترکیہ سے دلی محبت رکھتے ہیں۔ اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد خلافت کا جو نظام خلفائے راشدین کے دور میں شروع ہوا تھا۔ 1923ء تک وہ نظام ترکیہ میں قائم تھا۔ اگر آپ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ خلافت کے نظام میں ہر طرف امن اور چین تھا۔ ہر کسی کو انصاف میسر تھا۔ اسی لیے لوگ آج بھی اس نظام سے اتنی محبت رکھتے ہیں۔

ترکیہ کا پورا نام جمہوریہ ترکیہ ہے۔ اس کا دارالحکومت انقرہ ہے۔ ترکیہ کا رقبہ سات لاکھ اسی ہزار پانچ سو اسی مربع کلو میٹر ہے۔ آبادی تقریباً سات کروڑ ہے۔ ترکیہ میں ترکی، کردی، عربی، آرمینی اور یونانی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جب کہ سرکاری اور قومی زبان ترکی ہے۔ یہاں کے باشندوں کو ترک کہتے ہیں۔ ترکیہ میں 99.8 فی صد مسلمان بستے ہیں۔ ترکیہ کا طرز حکومت جمہوری ہے جب کہ کرنسی کا نام ترک لیرا ہے۔ پاکستان کا رقبہ ترکیہ سے 15516 مربع کلو میٹر زیادہ ہے۔ پاکستان کی آبادی ترکیہ سے تقریباً دس کروڑ زیادہ ہے۔ ترکیہ میں مسلمان پاکستان سے تقریباً 108 فیصد زیادہ ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کو سلطان سلیمان اول کے دور میں بہت عروج حاصل ہوا۔ سلطان سلیمان کی وفات 1566ء میں ہوئی۔ اس کی افواج فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے وسطی یورپ میں آسٹریا تک جا پہنچی تھیں۔ ترکیہ کی سلطنت عثمانیہ چھ سو سال تک قائم رہی اور یہ مسلمانوں کی ملی تاریخ کی عظمت کا منہ بولتا نشان تھی۔

ہر سال ہزاروں کی تعداد میں سیاح سیر کے لیے ترکیہ آتے ہیں۔ قدیم تاریخی مقامات سیاحوں کے لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔ آیئے! ان میں سے چند مشہور مقامات کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔

1- کوہ ارارات یا کوہ جودی وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی تباہ کن سیلاب کے بعد ٹھہری تھی۔ کوہ جودی اگیری (Agri) پہاڑ کے پاس ہے جو ترکیہ کا سب سے بلند مقام ہے۔

2- دولما باغچی محل، یہ محل آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل پر واقع ہے۔ یہ سلطان عبدالحمید اول کے حکم پر 1843ء سے 1856ء میں تعمیر کیا گیا۔ 1853ء سے 1922ء تک یہ محل حکومت کے انتظامی مرکز کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔

3- توپ کاپی محل، یہ محل ابتداء میں سلاطین عثمانیہ کی سرکاری رہائش کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سلطان محمد دوم فاتح قسطنطنیہ (استنبول) نے اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ 1465ء سے

1853ء تک یہ سرکاری تقریبات اور مہمانوں کے استقبال کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہیں پر ہمارے پیارے نبی ﷺ کا لباس اور شمشیریں اور دیگر تبرکات محفوظ ہیں۔

4- نیلی مسجد، یہ مسجد سلطان احمد اول کے حکم پر استنبول میں تعمیر کی گئی۔ یہ فن تعمیر کا شان دار نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1609ء میں ہوا تھا اور اس کی تکمیل میں سات سال لگے۔ اس مسجد کی ایک خوبی اس کے چھ مینار ہیں۔ عام طور پر مساجد کے ایک یا دو یا پھر چار مینار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سلطان نے مسجد تعمیر کرنے والے ماہر سے سونے کے مینار بنانے کے لیے کہا۔ اس کے لیے اس نے ایسا لفظ استعمال کیا جس سے معمار کو لفظ چھ کی سمجھ آئی۔ یوں اس کے چھ مینار بنا دیے گئے۔

ترکیہ کے بڑے شہر:

1- انقرہ۔ یہ ملک کے وسط میں ہے۔ 1923ء میں اسے ملک کا دارالحکومت بنایا گیا۔ انتظامی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک صنعتی تجارتی اور ثقافتی مرکز بھی ہے۔

2- استنبول (قسطنطنیہ)۔ یہ شہر آبنائے باسفورس اور بحیرہ مارمورا کے ساحل پر آباد ہے۔ بحیرہ اسود سے بحیرہ روم کو جانے والے سب بحری جہاز استنبول سے گزر کر جاتے ہیں۔ عثمانی دور حکومت میں استنبول دارالخلافہ تھا۔

3- ازمیر (سمرنا)، یہ ترکیہ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہ ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ یہاں سے ملک کے دوسرے حصوں کو سڑکیں جاتی ہیں۔

☆ قسطنطنیہ کا نام تو آپ نے بہت سنا ہوگا بلکہ اسے لکھنا اور بولنا کسی آزمائش سے کم نہیں۔ تو اب یہ ہے کہاں؟ کہیں نہیں گیا بھئی! وہیں پہ ہے۔ بس نام ذرا سا بدل گیا ہے۔ 1930ء میں اس کا نام بدل کر استنبول کر دیا گیا تھا۔ ویسے استنبول کے معنی ہیں ''اندرون شہر''

☆ ترکیہ میں اس وقت ریلوے کا انتہائی جدید نظام قائم ہے۔ ٹی سی ڈی ڈی (TCDD) سپین کی بنی جدید گاڑیاں ترکیہ ریلوے کا حصہ ہیں اور ان کی رفتار 260 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔

ترکیہ کے کھانے: کھانے کا نام لیتے ہی منہ میں پانی آ گیا نا! کھانا ہے ہی ایسی چیز اور ترکیہ کھانے...... ان کے بارے میں تو ایک جملہ بہت مشہور ہے۔ آؤ ترکیہ کی تاریخ جاننے کے لیے اور ٹھہرو ترکیہ کے کھانوں کے لیے! کباب، ترکیہ میں کباب بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ کھانوں میں زیادہ تر زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ سبزیوں میں بینگن ترکوں کو پسند ہے۔ ایک خاص ترکیہ کھانا ''دولما'' ہے۔

☆ سٹریٹ کیفے، یہ ترکیہ معاشرے میں عام ہیں۔ لوگ وہاں چائے یا ترکیہ کافی پینے جاتے ہیں۔ گپ شپ کے لیے اس سے اچھی جگہ کوئی اور نہیں کیوں کہ یہ کیفے عوامی مقامات میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں حقہ بھی پایا جاتا ہے اور میزوں پر باہمی دل چسپی کے چھوٹے موٹے کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں۔

☆ آج کا ترکیہ ماضی میں سلطنت روم کا حصہ تھا۔ جسے اناطولیہ کہتے تھے۔1071ء میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے جنوب مشرقی ترکیہ میں جنگ کے دوران میں رومی شہنشاہ کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور پھر چند سال کے اندر پورا اناطولیہ فتح ہو گیا اور اسلامی سلطنت کی حدود قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گئیں۔ پھر مقامی باشندے اسلام قبول کرتے چلے گئے اور یہ پورا خطہ جو پہلے روم کہلاتا تھا۔ اب ترکیہ کہلانے لگا۔

☆ نبی کریم ﷺ نے قسطنطنیہ فتح کرنے والے کو جنت کی بشارت دی تھی۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔ ''میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر چڑھائی کرے گا۔ ان کو بخش دیا گیا ہے۔'' (صحیح بخاری 2924)

☆ پاکستان اور بھارت کی طرح ترکیہ کے بھی اپنے ہمسائے یونان کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں ہیں کیوں کہ یونان پر ترکوں کی حکومت سو سال رہی پھر 1829ء میں یونانیوں نے آزادی حاصل کر لی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے ترکیہ کے کئی جزیرے یونان کو دے دیئے۔

☆ عزیز بچو! ہم اردو بولتے لکھتے اور پڑھتے ہیں مگر آپ کو شاید علم نہیں کہ شمالی ترکیہ میں بحیرۂ اسود کے ساحل پر اردو (ordu) نام کا شہر واقع ہے۔ جو اسی نام کے صوبے کا صدر مقام ہے۔ دراصل ترکیہ لفظ ''اردو'' کے معنی ہیں لشکر یا چھاؤنی۔ ہندوستان میں ترکیہ زبان بولنے والے مغلوں کی فوج (اردو) میں جو ملی جلی زبان پروان چڑھی اس کا نام بھی ''اردو'' پڑ گیا۔

☆ Cinnah Caddesi (جناح روڈ) ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ کی ایک مشہور سڑک ہے۔ یہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے نام سے منسوب ہے۔ ترکیہ زبان میں جناح کو Cinnah لکھتے ہیں۔

☆ اسلام آباد، کراچی، لاہور، پشاور اور لاڑکانہ میں بعض سڑکوں کا نام اتاترک روڈ رکھا گیا ہے۔

☆ 26 اکتوبر 2009ء کو ترکیہ کے وزیراعظم رجب طیب اردگان کو نشان پاکستان کا اعزاز دیا گیا۔ انہوں نے پاکستان کی پارلیمنٹ سے خطاب کیا۔ وہ دنیا کے چوتھے حکمران ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔

☆ ترکیہ کی حکومت اور عوام کے دل میں پاکستان کے لیے خاص محبت ہے۔ یہ بات ترک وزیراعظم نے کہی۔

☆ 17 جون 2017ء کو پاک فوج کے سربراہ جنرل قمر جاوید باجوہ نے ترکیہ کا سرکاری دورہ کیا۔ انہوں نے اتاترک کے مزار پر حاضری دی پھولوں کی چادر چڑھائی اور ترک قوم کے باپ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ایک سادہ اور پروقار تقریب میں پاک ترکیہ دفاعی تعلقات بڑھانے کے حوالے سے جنرل قمر جاوید باجوہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے۔ انہیں ''لیجنڈ آف میرٹ'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا۔ ''ترکیہ تمام پاکستانیوں کے دلوں میں خاص جگہ رکھتا ہے۔''

☆☆☆

''دادا جی! آپ جب چھوٹے تھے، تب آپ کون سے اسکول میں پڑھتے تھے آپ پڑھائی سے جی چراتے تھے؟ کیا آپ کو اسکول اچھا لگتا تھا؟ آپ کے دوست نالائق تھے یا پڑھے لکھے تھے؟

کیا آپ کو نظر کی عینک میٹرک میں ہی لگ گئی تھی یا پھر ایف ایس سی کے بعد اور ہاں دادا جی آپ اپنے امی ابو کو تنگ کرتے تھے کہ آج تو بھئی چھٹی! کچھ موج مستی بس لمبی عیش؟'' اتنے ڈھیر سے سوالات کرنے کے بعد زوبی فراگ نے لمبا سانس لے کر منہ سے ہوا خارج کی۔ دادا جان کہنے لگے۔ ''آؤ! تمہیں ایک کے بعد ایک سوال کا جواب دوں، پہلے اپنی امی جان کو بتا آؤ کہ تم یہاں ہو ورنہ، وہ تالاب کا چپہ چپہ چھان ماریں گی تمہاری تلاش میں، ہلکان ہوں گی۔'' ''او کے دادا جی! میں ابھی آیا۔'' پھدکتا پھدکتا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو دادا جی اپنے ماضی میں کھو گئے اور یوں ساکن ہو گئے جیسے تالاب میں آسمان کا عکس تھم گیا ہو اور یہ سکوت چند لمحوں بعد زوبی فراگ کے آنے سے چھن چھن کر کے بج اٹھا کیوں کہ چھوٹے بچوں کی قلقاریوں سے ماحول یوں ہی معطر ہو جایا کرتا ہے۔

''ہاں تو دادا جی! اب جلدی سے بولیے ناں۔'' ''تمہارے پہلے سوال کا جواب کچھ یوں ہے کہ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا جہاں تمہارے ابا جان اور پھر اب تم۔ یہ اسکول ہمارے بزرگوں کی نشانی ہے۔ صدیوں سے یہاں پیلو فراگ شہزادے کا راج تھا، جو بڑا عادل بادشاہ تھا۔ گو کہ وہ ایک نامنصف اور وحشی حکمران کی اولاد میں سے تھا۔ پیلو کے تمام بدن پر رنگ برنگے پیلے پیلے دائرے تھے، اسی لیے اسے پیلو شہزادے کا لقب ملا۔ اس کو پڑھائی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا، اس کا باپ پڑھائی، لکھائی کے خلاف تھا کہ کہیں اس کی غلام رعایا پڑھ لکھ کر باشعور ہو گئی تو اس کے کام کون کرے گا۔ حکومت کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے۔ ہر طرف سے سلام، خوشامد، جھوٹی تعریفیں۔ اسی وجہ سے مینڈکوں کو پڑھنے کی کھلی اجازت ہی نہ تھی جب ظالم حکمران مرا تو پیلو نے ایک اسکول قائم کیا۔ اس کا نام رکھا ''پڑھیے، لکھیے دوستو'' بس وہ دن اور آج کا دن سب اسے دعائیں دیتے ہیں ''آج تم بھی جن استادوں سے تعلیم حاصل کر رہے ہو وہ میرے دوستوں کے ہی تو بچے ہیں اور اب میں تمہارے دوسرے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ اتنے میں ڈھیر سے مینڈک پھدکتے پھدکتے قریب آ گئے۔ ''دادا جی! آپ اکیلے اکیلے زوبی فراگ کو کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ہم اپنے گھروں سے اجازت لے آئے ہیں۔ ہمیں آج چاہے رات ہی کیوں نہ ہو جائے! ہم کہانی ضرور سنیں گے۔'' دادا جی بچوں کی بات پر مسکرائے اور بولے۔ ''آپ سب کو ہم گھر تک چھوڑ آئیں گے۔'' تو سب اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے۔ زوبی فراگ بولا۔ ''خبردار! کوئی بیچ میں بولا، بات کاٹی یا سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔'' سب

نے کہا۔ ''اچھا دوست وعدہ چپ چاپ کہانی سننے کا مگر دادا جی کہانی تو نہیں سنا رہے وہ تو میرے سوالات کے جوابات دیئے جا رہے ہیں۔'' ''کوئی بات نہیں ہمیں سب سننا ہے۔'' یک دم سب یک زبان ہو کر بولے یعنی ٹرٹرائے۔ دادا جی نے سلسلہ کلام جہاں سے توڑا تھا، وہیں سے جوڑا۔ ''جیسے آپ کو اسکول بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے اور میرے ہم جماعتوں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ بیٹھنے کے لیے سرسبز گھاس کے اونچے اونچے، ٹیلے نما کرسیاں۔ شان دار گراؤنڈ۔ دوست سب ہی اول، درجے پر آتے۔ ہمارا باقاعدہ مقابلہ ہوا کرتا۔ سب کے سب لائق تھے، نالائق کس چڑیا کا نام ہے سب انجان تھے۔ نظر کی عینک تو مڈل ہی میں لگ گئی۔ میں بہت پڑھاکو تھا۔ تم لوگ تو شاید اتنے نہیں ہو۔ مگر کوئی نہ بولا کیوں کہ سب نے چپ رہنے کا وعدہ کیا تھا ناں۔ دل میں جواب دے کر بولے نہیں نہیں ہم بھی لائق ہیں نکمے نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ایف ایس سی کرنے ہمیں شہر والے اسکول میں روانہ کیا گیا تھا جسے ''فراگ کالج'' کہا جاتا تھا۔ ہر شہر سے مختلف رنگوں، جسامتوں، شکلوں کے مینڈک وہاں اکٹھے ہوئے۔ باقاعدہ ہمارا ہفتہ صفائی والدین کا دن، فن فیئر اور پکنک ڈے بھی منایا جاتا تھا۔ کیا بتاؤں کتنے مزے تھے۔ آہ کتنی جلدی وقت گزر گیا۔ اب تو میں سو سال کا ہونے والا ہوں۔ جوانی خوب اچھلتے کودتے گزری۔ سوچا ہی نہ تھا بڑھاپا بھی آئے گا۔''

زوبی فراگ نے جب دیکھا دادا جی اُداس ہو رہے ہیں تو جھٹ سے بولا۔ ''اور سوال تو آپ کھا گئے۔ پڑھائی سے جی چرانے والا سوال۔'' تب دادا جی ماضی کی بھول بھلیوں سے نکلے اور حال میں آ کر دیکھا تو ڈھیروں ننھے منے مینڈک بڑی آس سے انہیں تک رہے تھے اور سوال کرنے والا ان کا پوتا اپنی موٹی موٹی آنکھیں ان پر جمائے مسکرا رہا تھا۔ ''ہاں تو! کیوں بھئی میں کیوں جی چراتا۔ لنچ باکس میں میری ماما کینچوے، رنگ برنگے بھنورے، تتلیاں اور مکھیاں رکھ دیتی تھیں۔ مزے مزے کے کھانے اور پھر پینے کو پھولوں کا جوس۔ جب گھر واپس آتا تو ڈریگن فلائی کا سوپ۔ ساتھ میں گرما گرم کیڑے مکوڑے جنہیں روسٹ کیا ہوتا تھا۔ یہ سب پڑھنے لکھنے کا ہی انعام تھا۔ صبح صبح میرے پاپا یعنی تمہارے پردادا جی تازہ تازہ جوہڑی مچھلیاں مجھے کھلاتے تاکہ میرا دماغ مضبوط ہو اور توانائی ملے اور میں اسکول میں صحت مند دماغ کے ساتھ تعلیم حاصل کروں اور آخری سوال کا جواب میں اب تھوڑے سے آرام کے بعد دوں گا۔ وقفہ ضروری ہے۔ مجھے تازہ دم ہو لینے دو۔'' ''نہیں نہیں دادا جی! آپ سو گئے تو پھر آپ کو جگانا ناممکن سا کام ہے۔ برائے مہربانی ہمیں گھر بھیجنے کے بعد سوتے رہیے گا مگر رات ڈھلے لوٹ آیئے گا۔ سب انتظار کرتے ہیں۔''

''اچھا بچو!'' دادا جی نے منہ کھول کر لمبی سی جمائی لی تو سب کو نیند آنے لگی۔ ''امی ابو کو تنگ کرتا تو آج ایک پروفیسر فراگ نہ ہوتا، ان ہی کی دعاؤں کا ثمر ملا جو آج ایک بلند مقام پر پہنچا۔ اپنے اساتذہ کا تو اتنا احترام کرتا کہ ہر پل وہ دعائیں دیتے تم جان لو کہ باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب

ہمارے زمانے میں ایک مینڈک جیکی تھا۔ انتہائی نافرمان۔ اسے چند روز پہلے سب نے دیکھا کہ اسے عقاب اٹھا کر لے گیا، وہ اپنی طبعی موت نہیں مرا کیوں کہ وہ اپنے والدین کو، اپنے اساتذہ کو تنگ کرتا مثلاً منہ چڑاتا، ناراض ہوتا، ماں کے سامنے ٹرٹر کرتا، زبان چلاتا، باپ کے ساتھ کسی کام میں مدد نہ کرتا، اکڑتا غرور کرتا اپنی جوانی پر جس کا اللہ تعالیٰ نے بھی حساب لینا ہے بروز قیامت کہ جوانی کہاں گزاری۔ تمہیں طاقت ور بنایا۔ تم نے اس طاقت کا استعمال اچھا کیا کہ برا؟ اس کے علاوہ وہ ننھے جانوروں کو ستاتا، رلاتا، مارتا اور تمام اساتذہ کی نقل اتارتا، ان کی کرسی پر جا بیٹھتا، جو ادب کے سخت خلاف ہے۔ اپنے استاد کی کرسی یعنی نشست گاہ پر بیٹھنے والے بچے، بچیوں کے دماغ کمزور ہو جاتے ہیں، وہ پڑھتے ہیں مگر اچھا حافظہ نہیں رکھتے۔ ہم سب اسے بہت منع کرتے مگر وہ اور زیادہ شیطانیاں کرتا۔ کبھی اسے چوٹ لگتی، خون بہتا اور ایک شرارت میں تو وہ اپنی ایک ٹانگ بھی کٹوا چکا تھا مگر بے سود۔ اس کے امی ابو کا دل دکھتا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اس کا ہم سب کو مان رکھنا ہے اور عمل بھی کرنا ہے۔ آپ سب سے بھی جو گناہ ہو گئے، غلطیاں ہو گئی ہیں ان کی معافی مانگ لیں کیوں کہ زندگی کا کیا بھروسہ اور پھر اعمال کا حساب بھی تو دینا ہے نا آخرت والے دن پیارے بچو! اس لیے کسی کا دل بھی نہ دکھاؤ یہ تو اللہ کو سخت ناپسند ہے ایک شاعر کہتا ہے:

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے جو کچھ ٹھیندا ای
اک دل نہ بندے دا ڈھاویں رب دلاں وچ رہندا ای

اور پھر ماں باپ کا دل اللہ کا بنایا ہوا خوب صورت ترین دل ہے۔ اس اولاد کے لیے کتنی محنت اور جستجو کرتے ہیں۔ رہی بات چھٹیاں زیادہ کرنے کی تو ایسے بچے نوٹس نہیں بنا سکتے، استاد کی جھڑکیاں الگ سنتے ہیں۔ میں سخت بیمار ہوتا تو سال میں گن کر ایک آدھ چھٹی ہوتی تھی۔ ابھی بھی جا کر ریکارڈ چیک کرو گے تو میری بات سچی نکلے گی۔ ہمارے اسکول میں سو سال پرانا ریکارڈ بھی محفوظ پڑا ہے اور اب سنو عیش اور موج کی تو ہمیں ہفتے میں دو دن کی بجائے ایک دن چھٹی ہوتی تھی ہم لمبی تان کر سونے کی بجائے اپنے امی اور ابو کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد کرواتے تھے۔ ایک دن ہمارے اسکول میں بزم ادب کے لیے مخصوص تھا وہ سارا دن ادب، لطائف شعر، شعراء وغیرہ کے ساتھ گزر جاتا تو یوں سمجھو دو دن چھٹی ہوتی، پھر ایک دن ہمارا ایک سے لے کر تین بجے تک اپنے اساتذہ کے ساتھ مسئلے مسائل بتانے، سلجھانے کا بھی ہوتا اساتذہ ہماری سنتے، پیار سے مسئلے سلجھاتے۔ یوں اسکول کا زمانہ سنہرا زمانہ تھا پھر کالج کا زمانہ تو اور بھی سونے پہ سہاگہ تھا۔ مختلف ممالک کے استاد ہمارے کالج میں مقرر تھے ان کی ذہانت، علم اور دانائی ہم سب میں ان کی خصوصی شفقت و محبت سے یوں منتقل ہوئی کہ نسلیں سنور سنور گئی ہیں۔ اللہ ان کے درجے بلند فرمائے۔ ہمیشہ دعاؤں میں اپنے اساتذہ کرام کو بھی یاد رکھو کیوں کہ سب ہمارے روحانی باپ ہوتے ہیں۔ ہماری روح کی تشکیل کر کے اسے نیکی کی طرف مائل کرتے اور اچھے اخلاق پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ لو بچو! اب ہو گئے سوالات کے جوابات بالکل مکمل۔" پیارے پوتے زوبی! اس لیے اب گھروں کو لوٹ چلو! دیکھو شام کا ملگجا اندھیرا تالاب کو اپنی لپیٹ میں لینے کو ہے۔ مغرب کی اذانیں دور گاؤں والی مسجد سے بس اپنی آواز ہر سو روانہ کرنے والی ہیں اور آپ سب کی ماؤں نے یقیناً کھانا بھی تیار رکھا ہو گا۔ ذرا سونگھو تو ہوا کے ساتھ اُڑتی اُڑتی مٹر پلاؤ کی خوشبو تالاب تک آ رہی ہے۔ اس خوشبو کے ساتھ ساتھ روٹی پکانے کی اشتہا انگیز خوشبو ہوا لا رہی ہے۔" اب تو سب کی بھوک چمکنے لگی مگر روانہ ہونے سے پہلے سب نے دادا جی سے پھر اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ آپ اپنی زندگی میں ہونے والی ہر برسات کا انداز، رنگ اور یاد ہم سے شیئر کریں گے۔ "دادا جی آپ بہت سویٹ سویٹ ہیں۔ کاش! ہم سب کے دادا جی بھی آج زندہ ہوتے تو......" "بھئی رخصت ہوتے ہوئے آپ نے یہ کیا بات کہہ دی کیا۔ میں آپ سب کا مخلص اور ہم درد نہیں ہوں۔ زوبی بیٹے کا دادا جی ہونے کے ساتھ آپ کا بھی تو ہوں۔" "جی!" سب بیک وقت ٹرائے اور فضا بھی مسکرا اٹھی۔ اتنے میں زوبی فراگ نے عینک کی اوٹ سے دیکھا۔ اس کے امی ابو پھدکتے پھدکتے ادھر ہی آ رہے ہیں۔ "السلام علیکم بچو!" اور دونوں نے آگے بڑھ کر اپنے ابا جی کو گلے لگایا۔ سلام و دعا کے بعد بتایا کہ وہ انہیں احتراماً خود لینے آئے ہیں۔ دادا جی کا دل خوشی سے بھر گیا۔ سب مل جل کر ایک فوج کی صورت میں واپس اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے کہ ہم بھی ہمیشہ دادا جی کی طرح بنیں گے اور زندگی کو یوں ہی باعمل، بانصیب اور باادب بنائیں گے۔ ☆☆

1- ہو اگر کوئی بخار کا مارا
کیوں نہ چڑھے پھر اس کا پارا
2- دور پہاڑ پر سے آئے
گھر میں آ کر گھل مل جائے
3- جب دیکھو پانی میں پڑا ہے
پانی بہتا ہے وہ کھڑا ہے
4- تیلی کا تیل کمہار کا ہنڈا
ہاتھی کی سونڈ نواب کا جھنڈا

(میمونہ، راول پنڈی)

5- ٹانگیں ہیں دو چل نہ پائے
لیکن پھر بھی وزن اٹھائے
ہم زور لگا کر بند کریں
لیکن خود ہی کھل جائے

6- ایک موتی ہے کھٹا میٹھا
چھیلے بنا سب ہی کھائیں

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

7- ہاتھ لگے نہ ہاتھ میں آئے
بس کانوں سے پکڑی جائے
8- سو گھوڑے اور ایک لگام
آگے پیچھے چلیں تمام
9- کوئی نہ دیکھے اور دکھلائے
لیکن وہ سب کو تڑپائے
10- کالے تالاب میں کھولتا پانی
بیچ میں ناچے کون سی رانی
11- کھائے لوہا اگلے آگ
گائے ہر دم موت کے راگ

(مقصود اختر، لاہور)

جوابات: 1- تھرمامیٹر 2- نمک 3- پانی میں عکس 4- چراغ 5- چمٹا
6- انگور 7- آواز 8- کنگھی 9- درد 10- تالا اور چابی 11- توپ

تصویر کے حصے جوڑیے۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2017ء ہے۔

اگست 2017ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- پستی سے نکل آئے گی اب جلد میری قوم — رفعت لیے آیا ہے نئی صبح کا پرچم (مریم، حیدر آباد)
- کیوں حیران ہو ہماری اڑان پر — ہم پروں سے نہیں حوصلوں سے اڑا کرتے ہیں (عیشہ فاطمہ، فیصل آباد)
- جذبے جب فولاد ہیں تو کمزور غبارے کیا معنے — تابع ہیں فضائیں مومن کے ہم چلے ہیں پرچم لہرانے (طیبہ وحید، منڈی بہاؤ الدین)
- تیری عظمت مخالف سے منوائیں گے — تیرا پرچم بلندی پہ لہرائیں گے (مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ)
- ضروری نہیں کہ مقدور ہو جہاز — اڑنے کے لیے کافی ہے ذوقِ پرواز (محمد منیب انور، شیخوپورہ)

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہونہار مصور

یوم پاکستان

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

محمد زبیر جمشید، جہانیاں (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

زہرا شاہد، سرگودھا (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

عمارہ علی جہ، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

مومنہ عامر حجازی، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

نور فاطمہ، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: فائزہ شہزاد، لاہور۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ نور العین عینی، لاہور۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ نور ضیاء، لاہور۔ نادیہ رفیق، میاں چنوں۔ مریم سرفراز، ننکانہ صاحب۔ سدرہ اجمل سلیمی، کبیر والا۔ حبیب احمد، خانیوال۔ اسد اللہ، جویریہ خالد، اسلام آباد۔ آمنہ نعمان، لاہور۔ حماد ظفر اقبال، گوجرانوالہ۔ محمد ابراہیم، ؟؟۔ نیہا شرافت، اسلام آباد۔ ایمن یار محمد تنگی، چارسدہ۔ محمد عفان راجہ، گجرات۔ علیہ علی، لاہور۔ پلوشہ خٹک، پشاور۔ روشن نظر، لاہور۔ شاہ زیب، فیصل آباد۔ غیب انور، شیخوپورہ۔ فاطمہ نواز، گوجرانوالہ۔ سارہ وحید، بھمبر۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ شکیبہ جمیل احمد، عبدالرحمٰن جمیل احمد، حافظ آباد۔ شہیر اقبال، راول پنڈی۔ عینیہ، واہ کینٹ۔ زنیرہ بانو، کمالیہ۔ عیشاء احمد، واہ کینٹ۔ رائقہ، فیصل آباد۔ عائشہ حسن۔ مریم منیب، لاہور۔ ہادیہ خالق، ڈیرہ غازی خان۔ عیشا مبشر، خانیوال۔ نفیس احمد شیخ، ڈیرہ غازی خان۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

ستمبر کا موضوع
یوم دفاع
آخری تاریخ 8 ستمبر

اکتوبر کا موضوع
برڈ شاپ
آخری تاریخ 18 اکتوبر